باب دوم

دارالمصنفین اور معارف

① دارالمصنفین کی تاسیس

گزشتہ صفحات میں ہم نے دارالمصنفین کی تاسیس اور رسالہ معارف کے اجراء کے پس منظر کی حیثیت سے برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی و سماجی دور انحطاط، 1857 کے بعد کی بعض اہم تعلیمی تحریکات اور اس ضمن میں نئے انگریز حکمرانوں کی حکمت عملی کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا۔ اب ہم بترتیب دارالمصنفین کے قیام کے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ اس بحث میں ہم نے سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی کا ذکر مناسب سمجھا جن کے تخیل کی بنیاد پر دارالمصنفین کی عمارت قائم ہوئی اور رسالہ معارف اور دارالمصنفین کی جملہ علمی کامرانیاں دراصل ان ہی کے خواب کی سچی اور حسین تعبیر ہیں۔

۱۔ بانی و مؤسس مولانا شبلی 1857 میں ضلع اعظم گڑھ کے موضع بندول میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ حبیب اللہ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ 18 سال کی قلیل عمر میں منطق فلسفہ فقہ تفسیر حدیث اور دیگر علوم مروجہ میں ید طولیٰ حاصل کر لیا۔ 19 سال کی عمر میں حج کو روانہ ہوئے اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں حدیث کی بعض نایاب کتابیں آپ کی نظر سے گزریں۔ سفر حجاز سے واپس آکر پھر عصری علوم کے عمیق مطالعہ اور کسب کمال کی جان توڑ محنت میں لگ گئے۔ شعر و شاعری کا مشغلہ بھی اختیار کیا اور اردو و فارسی کے دیوان پر عبور حاصل کیا

1882 میں آپ نے ایم اے او کالج کی پروفیسری قبول کی۔ اس زمانہ میں کالج کے دائرۂ علمیہ میں مولانا حالی اور مسٹر آرنلڈ بھی شریک تھے۔ مسٹر آرنلڈ کے علمی خیالات سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے مسٹر آرنلڈ کو کتاب 'دعوت اسلام' کی تصنیف و ترتیب میں بڑی مدد دی۔ مسٹر آرنلڈ نے شبلی سے عربی سیکھی اور شبلی نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان کا درس لیا۔ 1898 تک وہ ایم اے او کالج سے وابستہ رہے۔ اسی اثناء میں متعدد کتابیں لکھیں جنھوں نے قومی فضا میں لہر پیدا کردی۔ 1884 میں مولانا شبلی نے مثنوی 'صبح امید' لکھی جو آپ کی ادبی صلاحیتوں کا نقش اول ہے۔ 1889 میں 'المامون' تصنیف کی۔ یہ کتاب ان کی سیرت نگاری کی پہلی زبردست کوشش تھی۔ پھر 'الجزیہ' اور 'کتب خانہ اسکندریہ' نامی کتابیں مرتب کیں۔ 1893 میں 'سیرت النعمان' مکمل ہوئی۔ پھر 'سفرنامہ روم و مصر' مرتب فرمایا۔ 'الفاروق' 1899 میں جبکہ آپ کشمیر میں تھے تکمیل کو پہونچی۔ جب انھوں نے اس گراں بہا تصنیف کی آخری سطریں لکھیں اس وقت آپ بستر علالت پر دراز تھے اور گھنٹوں بے ہوشی کی حالت رہتی تھی۔ اپنے مقصد سے لگن اور علمی وابستگی کی یہ بہترین مثال ہے۔ اسی سال وہ ریاست حیدرآباد میں شعبہ علوم و فنون کے ناظم مقرر ہوئے۔ 1902 میں 'الغزالی' اس کے بعد 'علم الکلام' 'موازنہ انیس و دبیر'

'سوانح مولانا روم' وغیرہ کتابیں طبع ہوئیں ۔ اسی دوران حیدرآباد کو چھوڑ کر لکھنؤ آئے اور 1898 میں ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی ۔ 1912 تک ندوہ کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے خدمت کرتے رہے 1913 میں اعظم گڑھ چلے آئے اور 'شعر العجم' کے کئی حصے شائع کئے جو اردو کا بے مثال ادبی و تنقیدی شاہکار ہے اور جس پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام عطا ہوا ۔ 1914 میں 'سیرت النبی' زیر تصنیف تھی کہ 18 نومبر 1914 کو پیام اجل آگیا ۔ عمر طبعی مختصر یعنی 57 برس پائی ۔

جن لوگوں نے علامہ کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کتابوں میں ایک قسم کی جدت ہے ۔ طرز ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ تاریخی واقعات میں رنگ آمیزی کو بالکل راہ نہیں دی گئی ہے اور بے مثال تحقیق اور عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے ۔ اپنی طبیعت سے کسی بات کو پیدا کرنا' پیچیدہ مسائل کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں سے نکالنا اور اسے سلجھا کر ایسے طور سے ترتیب دینا کہ اپنی حالت میں نظر آنے لگے ' یہ وہ خصوصیات ہیں جو علامہ کو دوسرے مصنفین سے ممتاز بناتی ہیں ۔ عام طور پر لوگ علامہ کی شہرت کی بنا آپ کی لسانی اور ادبی خدمات کو سمجھتے ہیں ۔ بلاشبہ آپ اردو زبان کے ایک بڑے محسن تھے لیکن آپ کے کمالات کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے ۔ چنانچہ ایک جرمن دانشور فرماتے ہیں ' ہندوستان کے علماء و مصنفین میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ۔ اول تحقیق کی صلاحیت ' دوم جانچ پڑتال' سوم جدت' چہارم رائے اور دلیل کی مضبوطی ۔ یہاں کے علماء و مصنفین میں مبالغہ کی بہت عادت ہے اور ان کی تاریخی حکایتوں اور جنگی افسانوں میں اس کی بہتات نظر آتی ہے ۔ اس کے برعکس اہل مغرب کے دماغ دل نشین دلائل اور درست الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں ۔ اہل مغرب کی کسوٹی پر اگر ہندوستان کے کسی مصنف کی تصنیف پوری اترتی ہے تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں ۔ [1]

آپ اعلیٰ درجے کے مقرر بھی تھے ۔ آپ کی تقریریں ایسی پُر مغز ہوتیں کہ بڑے بڑے اہل علم جھوم جاتے ۔ آپ کی غیر معمولی قابلیت کا اعتراف حکومت کو بھی تھا ۔ چنانچہ 1894 میں جبکہ آپ صرف 37 سال کے تھے حکومت نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا ۔ الغرض علامہ اپنے عہد میں قابل ترین

---

[1] مولانا شبلی ــــ حسین خطیب ص 115 ماخوذ از رسالہ دانش ور لاہور شبلی نمبر دسمبر 1955ء

ہستی تھے۔ اگر کوئی ایک شخص شاعر، مورخ، فلسفی، نقاد، ماہر تعلیم، معلم، واعظ، مصلح، فقیہہ، محدث سب کچھ ہو سکتا ہے تو علامہ ہی کی ذات تھی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تاریخ ادب اور تحقیق میں آپ کا پایہ خاص طور پر بلند ہے، اتنا بلند کہ ملک کے کسی اور مصنف کی اس تک رسائی مشکل ہے۔

[1] اک عالم کو مسلم ہے ترا فضل و کمال + پھر نہ مانے کوئی حاسد تو جنوں ہے یا خلل

علامہ جیسی باکمال ہستی مادر گیتی بہت کم پیدا کرتی ہے۔ اگر وہ ہندوستان کے بجائے یورپ کے کسی خطہ میں پیدا ہوئے ہوتے تو آسمان شہرت پر آفتاب بن کر چمکتے مگر سوئے اتفاق آپ ایسی خاک سے پیدا ہوئے جہاں کم ذوقی اور ناقدر شناسی نے سیکڑوں اہل کمال کے رخ نمود پر گمنامی کے تیرہ و تار پردے ڈال دئے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ علامہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ نہیں، بلکہ آپ کا نام اب بھی زندہ ہے اور غالباً دنیا میں جب تک علمی کمال، تاریخی تحقیق اور ادبی لطافت کا سکّہ جاری رہے گا ان کے نام کی گونج سنائی دیتی رہے گی مگر یہ ضرور ہے کہ ممدوح کی قدر دانی جیسی ہونی چاہئے تھی ویسی نہ ہوئی اور آپ کا نام ایک مخصوص حلقے میں محدود ہو کر رہ گیا۔

اردو زبان کے مشہور ادیب اور انشاپرداز مولانا عبدالحلیم شرر نے آپ کی وفات کے بعد جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ قابل غور ہیں "ہندوستان میں بہت سے علماء و فضلاء پیدا ہوں گے، بہت سے شعراء پیدا ہوں گے، بہت سے انگریزی کے قابل و متبحر پیدا ہوں گے مگر شبلی پھر پیدا ہوں ممکن نہیں۔" [2] آگے چل کر لکھتے ہیں "سرسید کو مولانا شبلی کے علمی کمالات کا کچھ ایسا اعتراف تھا کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے۔ اعتقادی اور تاریخی تحقیق میں علامہ شبلی ہی سے مشورہ لیتے۔ مختصر یہ کہ سرسید احمد خان آپ کی وسعت نظر، نکتہ رسی اور کمال تحقیق کے معترف ہو گئے تھے۔" [3] بزرگ صحافی اور ناقد نیاز فتح پوری لکھتے ہیں "شبلی ادیب تھے، نقاد تھے، شاعر تھے اور دور حاضرہ کے اردو ادب میں اساسی حیثیت رکھتے تھے۔" [4] مولانا شبلی کی سیرت نگاری کا حق ادا کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمن لکھتے ہیں "اگر کسی زبان سے یہ کہتے سنتا ہوں کہ مولانا شبلی بہت بڑے ادیب تھے تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہوں کہ نہیں وہ بہت بڑے مورخ تھے اور اگر کوئی ان کو مورخ کہتا ہے تو پھر میرا بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اس کو بتاؤں کہ نہیں وہ بہت بڑے متکلم تھے اور اگر کوئی ان کو متکلم کہتا ہے تو پھر میری خواہش ہوتی ہے کہ اس سے کہوں کہ نہیں وہ بہت بڑے شاعر تھے اور اگر کوئی شاعر کہتا ہے تو پھر جی چاہتا ہے کہ اس کو قائل کروں کہ وہ بڑے سیرت نگار تھے۔ اور پھر یہ بھی کہ وہ بہت بڑے ادیب تھے، بہت بڑے شاعر، بہت بڑے نقاد، بہت بڑے مورخ، بہت بڑے متکلم، بہت بڑے سیرت نگار، بہت بڑے فلسفی اور بہت بڑے عالم ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری اور ان کی عظمت کا صحیح

اندازہ وہ شخص نہیں کر سکتا جو صرف ادیب ہے یا صرف نقاد ہے یا صرف شاعر ہے یا صرف مورخ ہے یا صرف متکلم ہے یا صرف سیرت نگار ہے یا صرف عالم ہے ۔ ان کے علمی اور ادبی محاسن کا معترف صحیح معنوں میں وہی ہو سکتا ہے جو ان ہی کی طرح جامعیت رکھتا ہو لیکن اس جامعیت کا کوئی اہل قلم ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے یا تو کسی ادیب نے صرف ان کے ادب وانشا کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے یا کسی نقاد نے ان کے فن تنقید نگاری کا جائزہ لیا ہے یا کسی محقق نے ان کے طرز تحقیق پر نظر ڈالی ہے لیکن کوئی بھی ان کی جامعیت کا صحیح معنوں میں احاطہ نہیں کر سکا ہے

علامہ کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت اپنی قوم کے ساتھ والہانہ مناسبت اور بے پایاں ملی درد تھا۔ وہ قوم کے غم میں گھلے جاتے تھے اور کسی ایسے لائحہ عمل کی تلاش میں تھے کہ اپنی قوم کے جمود و خمود کے طلسم کو توڑ دیں ۔ انھیں یقین تھا کہ ایک دن ان کی قوم خواب خرگوش سے بیدار ہوگی اور طوفان بلاخیز میں قوم کا جو سفینہ ہچکولے کھا رہا ہے وہ ایک دن ساحل پر لنگر انداز ہوگا ۔ وہ خود اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں :

؎ عجب کیا ہے کہ یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھل آئے + کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

علامہ شبلی نے اپنی ایک نظم میں اپنی قوم کو مخاطب کرکے کہا تھا :

یوں بھلانے کو تو ہم دل سے بھلاتے ہیں مگر —— یاد آجاتے ہیں پھر بھی ترے اگلے جوہر
وہ بھی اک دن تھا کہ جس سمت سے ہوتا تھا گزر —— ساتھ چلتے تھے جلو میں ترے اقبال و ظفر
تو کبھی روم میں قیصر کو مٹا کر آئی —— کبھی یورپ میں نئے فتنے اٹھا کر آئی
تھے نقیبوں میں ترے دولت و اقبال و حشم —— ترے حملوں سے دہل جاتا تھا سارا عالم
ایشیا کا جو کیا تو نے مرقع برہم —— جا کے یورپ کے افق پر بھی اڑایا پرچم
کر دیا دفتر تاتار کو ابتر تو نے —— نیزہ گاڑا تھا جگر گاہ تتر پر تو نے
کون تھا جس نے کیا فارس و یونان تاراج —— کس کی آمد میں فدا کر دیا جے پال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج —— کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا —— یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خون جن کا
ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے —— یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے —— دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر —— یادگاروں کو زمانہ سے مٹا دیں کیونکر
مرو و شیراز و صفاہان کے وہ زیبا منظر —— بیت حمرا کے وہ ایوان و دیوار و در

مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر ـــــ اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذرّوں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک ـــــ داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر اب تک
ان سے سن لے کوئی افسانۂ یاران وطن ـــــ یہ دکھا دیتے ہیں آنکھوں کو وہی خواب کہن
تیرے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن ـــــ تیرے ہی نغمۂ پُر درد کے ہیں یہ ارگن
پوچھتا ہے جو کوئی ان سے نشانی تیری ـــــ یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری

مولانا شبلی کی تمام تصانیف بلکہ دارالمصنفین کی بیشتر تصانیف اور معارف کے زیادہ تر مضامین ان ہی اشعار کی تفسیر و تشریح ہیں۔ مولانا شبلی نے اسلام کے عروج شاہی، شان کجکلاہی اور مسلمانوں کے مفاخر قومی کی مدح خوانی کر کے ان کے تھکے ہوئے کارواں کو آگے بڑھنے کی ہمت دلائی بلکہ اسلامی روایات کی رجز خوانی کر کے مسلمانوں کو للکارا اور یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ انھوں نے ایک ہلّہ بول کر اور ایک طوفانی حملہ کر کے مخالفوں کو پسپا کیا۔ ان کی تصانیف پر چاہے کتنی تنقیدیں کی جائیں لیکن مسلمانوں کو آج بھی ان کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان کی گذشتہ عظمت و شان کا تاج پھر سے پہنا رہا ہے اور گل و گلزار میں بسی ہوئی تحریروں کے ذریعے ان کو ان کے ماضی کی بہاریں دکھا کر ان کے حال کے خزاں کو بدل کر ان کے مستقبل کو پھر سے چمن زار بنانا چاہتا ہے اور اسی میں مولانا شبلی کی عظمت کا راز ہے

مولانا شبلی کا یہ پیام اب بھی مسلمانوں کے لئے ہے:

اے مدعیان حُبِّ اسلام ـ حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ ـ ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
دیکھو! وہ نتیجہ یہی ہے ـ میدان یہی ہے! گو یہی ہے
کردو جو گذشتہ کی تلافی ـ ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی!
گو دور فلک ہوا دگرگوں ـ پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی ـ اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی

مولانا شبلی میں احساس اور غیرت مندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ دولت انھیں اپنے حساس اور غیور آباواجداد سے وراثتاً ملی تھی جس کو اسلامی رنگ نے اور دو آتشہ کر دیا۔ شبلی نامہ میں شیخ محمد اکرام نے مولانا شبلی کی بابت لکھا ہے کہ وہ راجپوت نسل سے تھے اور ان میں اس قوم کی ساری خودداری، زود حسی، اولوالعزمی، قبیلہ پروری اور جنگجوئی موجود تھی لیکن وہ خالص راجپوت نہ تھے، ان میں بہت سا باہر کا خون ملا ہوا تھا۔ ان کا خاندانی لقب عام مسلمان راجپوتوں کی طرح کنور یا رانا یا چودھری یا خان نہ تھا شیخ تھا۔ ان کے سب سے پہلے بزرگ جن کے سلسلہ

تحقیق و تفتیش کی کڑیاں پہونچتی ہیں شیوراج سنگھ جی تھے ۔ ان کے مسلمان ہونے کا ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو نہ صرف نہایت درجہ دلچسپ ہے بلکہ شبلی کے موروثی طبعی رجحانات پر بھی روشنی ڈالتا ہے ۔ علامہ کے ایک عقیدت مند شاگرد مولوی اقبال احمد سہیل اپنی ناتمام سیرت شبلی میں لکھتے ہیں " ایک دن شیوراج سنگھ جی کو شدید گرمی کے موسم میں صبح نہار منہ علاقے کی زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا ۔ اتفاق سے دیر ہوگئی ۔ دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کرکے مکان پر پہونچے ۔ بھوک پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے ۔ گھر میں اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے ۔ یہ خیال نہیں رہا کہ جوتیاں باہر اتار دیں ۔ ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے اب تک بے آب ودانہ تھیں بگڑ کر بولیں " کیا نرے ترک ہی ہوگئے " جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا بھرشٹ کر ڈالا " ۔ یہ بھی ٹھہرے آخر راجپوت ، ان کو بات کی برداشت کہاں ، وہ بھی ایسا شدید طعنہ اور عورت کے منہ سے ۔ شیوراج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنتے ہی کہا کہ ہم کو ترک ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو سچ مچ ترک ہو ہی جاتے ہیں ۔ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جاکر نہ صرف اپنی تشنگی بجھائی بلکہ دین حق کے آب حیات سے بھی سیراب ہوئے اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا ۔ خدا کی شان ہے جب کسی کو راہ ہدایت دکھانا ہو تو ایک عورت کا طعنہ نوائے سروش بن جاتا ہے اور وہ کام کرلیتا ہے جو سیکڑوں علماء کے وعظ و تبلیغ سے ممکن نہیں ۔ ٹھاکر شیوراج سنگھ جی کی طبیعت کی تیزی اور زود حسی ہونے کی چیز نہیں ۔ کیونکہ ان کی اولاد کو بھی اس میں سے پورا پورا حصہ ملا تھا اور شبلی کی شخصیت میں کوئی چیز اس قدر نمایاں نہیں جتنی یہ شدید ذکاوت حس ۔ [۵]

شبلی کا بڑے سے بڑا پرستار یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آئندہ ان سے بڑھ کر کوئی ادیب نہیں ہوگا ، ان سے بہتر کوئی مورخ نہیں ہوگا ، ان سے زیادہ دل آویز طریقہ پر کوئی سوانح نگاری نہ کر سکے گا یا ان سے زیادہ موثر طریقے پر علم کلام اور فلسفہ کو پیش نہ کر سکے گا ۔ آگے چلکر ان سے بڑھ کر ادیب بھی ہوں گے ، مورخ بھی ، سوانح نگار بھی اور متکلم بھی لیکن ہر زمانہ میں شبلی شبلی ہی رہیں گے [۶]

---

۲ + ۳ دار المصنفین اعظم گڑھ ـــــ نجمہ آفندی صـ ۱۱۱ ماخوذ از رسالہ بزم ادب حیدرآباد شبلی نمبر جون ۱۹۸۰ء

۴ علامہ شبلی ـــــ ثاقب لکھنوی صـ ۵۰ ماخوذ از رسالہ بزم ادب لکھنؤ شبلی نمبر 1975ء

۵ شبلی نامہ ـــــ شیخ محمد اکرم صـ ۱۵ بحوالہ رسالہ الاصلاح نومبر 1936ء

۶ مولانا شبلی کیا تھے ـــــ سید صباح الدین عبدالرحمن ماخوذ از رسالہ البصیر شبلی نمبر صـ ۱۹۲

علامہ نے جب قلم سنبھالا تو مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت ختم ہو چکی تھی، ان کی شاندار تہذیب ماند پڑ رہی تھی اور ایک ایسی سلطنت قائم ہو رہی تھی جس کے حکمرانوں کے تمدن کی ظاہری چمک دمک آنکھوں کو چکا چوند کر رہی تھی۔ علامہ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے آئینہ سے اس گرد و غبار کو صاف کیا جو انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ان کی لائی ہوئی آندھی نے ان پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ علامہ مسلمانوں کے عہد زریں کے ان تمام مرقعات کو منظر عام پر لائے جو نگاہوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

1857 کے بعد بدلے ہوئے حالات میں نئی زمین اور نیا آسمان بن رہا تھا۔ مسلمانوں کو اس وقت ضرورت تھی کہ کوئی ان کی مذہبی غیرت کو برقرار رکھے، ان کو قومی جوش دلاتا رہے، ان کو ان کی شاندار روایات سے آشنا رکھے اور ان کو ان کی عظمت بھی محسوس کراتا رہے اور پھر ان کے مذہب تہذیب اور ثقافت پر حملہ کرنے والوں کے خلاف نبرد آزما بھی ہو۔ کارکنان قضا و قدر نے مولانا شبلی کو اسی کام کے لئے پیدا کیا۔ ان کی عالمانہ صلاحیت، متکلمانہ طرز استدلال، محققانہ بصیرت، مورخانہ تلاش و تحقیق، فلسفیانہ ژرف نگاہی، ناقدانہ گہرائی، انشا پردازانہ لالہ کاری اور شاعرانہ رنگین بیانی میں جو اسپرٹ کارفرما ہے وہ یہی کہ وہ مسلمانوں کو ان کی برتری کا احساس دلائے۔ ان پر الزام ہے کہ وہ صرف مداحی کرتے ہیں یعنی وہ مسلمانوں کی تاریخ کے صرف پرعظمت اور پرشکوہ واقعات ہی لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس الزام کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی بھی ان کی تصانیف اور مقالات پڑھتا ہے تو وہ غیر ارادی طور پر محسوس کرتا ہے کہ ان میں باد سحر کے جھونکے بھی ہیں، خوشبو کی لپٹ بھی، سبزہ کی مہک بھی، بلبلوں کی چہک بھی، طاؤس کی جھنکار بھی اور آبشاروں کا شور بھی۔ اور وہ جہاں ان کی انشا پردازی کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے محظوظ ہوتا ہے وہاں وہ ان کے تحقیقی انکشافات اور تاریخی رازوں کی پردہ کشائی سے بھی مرعوب ہوتا ہے۔ علامہ کا شمار عالم اسلام کے ان صاحبان بصیرت اور صاحبان عشق میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریکوں، تنظیموں اور تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کو جگانے اور ان کے اندر جوش و ولولہ پیدا کرنے کا عظیم کام انجام دیا۔ ان کی شخصیت علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر ہے ؎ خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

شبلی کی حکمت و بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ابوعاصم ایڈوکیٹ لکھتے ہیں "1857 کے خونی انقلابات کے بعد مسلمانوں میں ایک ذہنی کشمکش شروع ہوئی۔ قدیم طرز معاشرت اور قدیم طرز فکر، جدید طرز معاشرت اور جدید طرز فکر میں باہمی ٹکر شروع ہوئی۔ اس مغربی استیلاء نے ایسی چمک دمک دکھائی جس نے بہت سے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مغرب کے راستے سے آنے والی شے ہدایت اور نجات کا ذریعہ ہے اور اپنی ہر چیز یا تو قابل نفرت ہے یا پھر اس کے لئے وجہ جواز صرف مغرب ہی سے ملے تو مستند ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف

ان علماء و فضلاء کی جماعت تھی جو مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو کفر و شرک سمجھتی تھی ۔ نتیجتاً ملت میں ایک خطرناک خلیج پیدا ہوتی جا رہی تھی جس کو پاٹنے والا کوئی نہ تھا اور وہی خلیج آئندہ احتساب، غیریت اور آخر میں کشمکش کا سبب بننے والی تھی ۔ مولانا شبلی کی ذات وہ سنگم تھی جس میں دونوں طرف کے دھارے آکر مل گئے تھے اور انھوں نے ایک ایسے مکتبۂ خیال کی بنیاد رکھی جس نے دین کا علم اور اس کی محبت قلوب میں پیدا کی اور ساتھ ہی ساتھ مغرب کی مفید معلومات جدید علم و دانش اور طرز تحقیق کو قبول کرنا اسلام کی خدمت سمجھا، اپنوں کی بیگانگی دور کرنے کی کوشش کی، احتساب اور غیریت کا پردہ اٹھانے کی سعی کی"[۴]

شبلی کی تحریروں اور خطوں کے انداز سے یہ بات بخوبی عیاں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں سرشار تھے اور اس کے خلاف کسی بات کو برداشت کرنے یا سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں : " ایک روز فرمایا کہ وہ اپنی تحریروں کو نوک سوزن اور نیشِ خار سے آلودہ کرنا گوارہ نہیں کرتے۔ اس کو شرافت اخلاق کے موتیوں سے جھلملاتا دیکھنا پسند کرتے ہیں، البتہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اللہؐ کے خلاف کوئی تحریر دیکھتے تو ان کا قلم بے قابو ہو جاتا ہے اور اس سے ایسی زہریلی تحریر نکل پڑتی ہے کہ سات سمندر کا پانی بھی اس زہر کو زائل نہیں کرسکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "[۵]

شبلی کے وجود میں PAN ISLAMISM کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ شبلی کی نفسیات اور شخصیت کی عکاسی کرتے ہوئے شیخ عطاءاللہ لکھتے ہیں "شبلی کو اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ اور اسلامی فنون سے جو شیفتگی تھی اس کا فطری اقتضاء یہ ہونا چاہئے کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ہو اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے ہیں اس کو وہ مجسم بھی دیکھ سکتے ۔ دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ہو، یہی ان کی سیاست تھی۔ ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لئے سراپا سپاس تھے دوسری طرف یورپ کے دست برد سے ہمہ تن فریاد۔ اس جذبہ نے ہندوستانی سیاست کی ایک شکل ان کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ ملک ہندو مسلمان کا متحدہ وطن ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی سیاسیات کا تعلق ہے وہ پورے طور پر پین اسلامی تھے ۔ پین اسلامی جذبہ کا تقاضہ یہی ہے کہ مسلمانوں کو اگر کہیں گزند پہونچے تو ایک کے تلوے کے کانٹے کی خلش دوسرے کے جگر میں محسوس ہو اور اس کے مداوا کی کوشش کی جائے ۔ اگر مسلمانوں کو کہیں کوئی نعمت میسر آئے اور کفر کے مقابلے میں سربلندی نصیب ہو تو ہمارے دل مسرت سے لبریز اور ہمارے سر شکرانے میں سجدہ ریز ہو جائیں ۔ غلام قوموں کے لئے ایسے جذبۂ اتحادی کی پرورش باعث وبال ہو جاتی ہے ۔ غیر قومی حکمرانوں نے مسلمانوں کے سینوں سے اس مقدس آسمانی و روحانی جذبہ کو چھین

دینے میں ان کے سینے چاک کر دیے لیکن یہ جذبہ ان کے ارواح و اذہان میں اسلام نے کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے کوئی چھری اسے چھیل نہ سکی اور کوئی چھلنی اسے نکال نہ سکی ۔ دو تین صدیوں سے اغیار اس کوشش میں ہیں لیکن یہ نشہ دماغوں سے نکلتا نہیں ۔ غیروں نے اس نشہ کو اتارنے کے لئے مسلمانوں میں وطن و قومیت کے خوبصورت بت تراشے اور ہر حیلے بہانے سے مسلمانوں کو ان بتوں کی پوجا پر مائل اور ان کی کرامت کا قائل کرنا چاہا ہے اور اس طرح جذبۂ دینی اسلامی کو نقصان پہنچانے کی سرتوڑ کوشش کی اور ایک حد تک مسلمانوں کو مصری، ترکی، ہندی، افغانی، عربی پن پر مائل کر دیا لیکن اسلامی ممالک کی حالیہ سیاسی آزادیاں اور خود مختاریاں اور وہ جذبۂ اتحاد جو منشاء اسلام کے مطابق ہے اور وہ سیاسی قوت اور استحکام جو اسلامی ممالک کو اس اتحاد سے حاصل ہو سکتا ہے اسلام پسندی میں ہے ۔ چنانچہ حالات کی موجودہ مساعدت عالم اسلام کے اتحاد و یگانگت اور اسلام کی عالمگیر اخوت کی ھمہ گیر تشکیل کے لئے گلا پھاڑ پھاڑ کر دعوت دے رہی ہے ۔ [9]

شبلی کی ہمہ جہت شخصیت اور علمی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مائل نقوی نے بڑے خوبصورت انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے: [10]

یوں تو موجود مورخ بھی تھے نقاد بھی تھے ۔۔۔ ادب و فلسفہ و شعر کے استاد بھی تھے
پھر بھی وہ دل جو تھے عرفان عمل سے مانوس ۔۔۔ شبلیؔ وقت کی کرتے تھے ضرورت محسوس
آ کے اک درس نیا سب کو دیا شبلی نے ۔۔۔ یعنی جو کام رکا تھا وہ کیا شبلی نے
جمع تھے شبلی مرحوم میں وہ وصف تمام ۔۔۔ مجتمع ہوں کسی اک فرد میں ہے مشکل کام
قدماء کے ہوں کمالات کہ افکار جدید ۔۔۔ ہیں، بس یہ کہ وہ ان سب میں تھے فرد فرید
صرف یہ بھی نہیں، جو بھول گئے تھے اسباق ۔۔۔ مرتب کئے ہر اک کے پریشان اوراق
بلکہ اک جان نئی علم و ادب میں ڈالی ۔۔۔ اہل بینش کو دکھائی وہ فکر عالی
نئی تہذیب سے ترمیم کئے کہنہ اصول ۔۔۔ نئی ترتیب سے قائم کئے ابواب و فصول
فن تاریخ کے جو مسخ ہوئے تھے آئین ۔۔۔ شکل اصلی میں وہ سب آ گئے باصد تزئین
اپنے مرکز پہ بھٹکے ہوئے حالات آئے ۔۔۔ ہو بہو سامنے ماضی کے مقامات آئے

---

۷ یاد رفتگاں — سید سلیمان ندوی از مقدمہ سید ابو عاصم ایڈوکیٹ ص ۵

۸ بزم رفتگاں — سید صباح الدین عبدالرحمٰن حصہ اول ص ۱۱۵

۹ رسالہ البصیر شبلی نمبر مقالہ شبلی ایک پین اسلامسٹ مرتبہ شیخ عطاء اللہ

۱۰ ایضاً نظم علامہ شبلی اور ان کے علمی کارنامے از مائل نقوی

② رفقاء اور منتظمین دار المصنفین 49

علامہ شبلی کی سوانح، خدمات اور علمی و تعلیمی کارناموں کے لئے تو قدر دانوں کی نظر میں حیات شبلی کی نہایت ضخیم کتاب بھی کم ہے۔ ہم نے ان کی زندگی کا ایک اجمالی مرقع پیش کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدا کے ساتھ اس سلسلہ زریں کا بھی اسی موقع پر ذکر کر دیا جائے جو جانشینان شبلی اور پھر ان کے رفقاء، تلامذہ اور فیض یافتگان سے عبارت ہے۔ ان حضرات کے ذکر کے بعد دار المصنفین کے قیام کے متعلق علامہ شبلی کے خیالات اور ان کے رفقائے خاص کی مساعی کا ذکر ہوگا۔

اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ سرسید کے حلقۂ احباب میں سے ہر شخص اپنی جگہ برصغیر میں ایک تاریخ ساز شخصیت بن کر ابھرا اور اس تحریک کو جلا بخشنے اور فروغ دینے میں اپنا بھرپور رول ادا کیا۔ اگر سرسید کو ایسے بے مثال رفقاء کا ایثار اور خلوص حاصل نہ ہوتا تو شاید اس تحریک کو پنپنے اور منتہائے عروج تک پہونچنے کے لئے راہیں استوار نہ ہو پاتیں۔ ٹھیک یہی معاملہ مولانا شبلی کے رفقاء، حاشیہ نشینوں اور شاگردوں کے حق میں بھی ثابت ہوتا ہے جنھوں نے اپنی محدود صلاحیت کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس تحریک کو زندہ رکھا بلکہ روز بروز پروان چڑھانے میں اپنا مثالی اور تاریخی کردار ادا کیا۔ اپنی بے مثال تحقیقی و علمی صلاحیت سے ایک بے آب و گیاہ صحرا میں اس نخل نوخیز کی اپنے خون جگر سے اس طرح آبیاری کی کہ ہر برگ و بار ایک نئی تازگی اور شادابی کے ساتھ ایک نئی چمک دمک اور تابندگی لئے ہوئے دور سے آنے والے ہر کاروان حیات کا نقطۂ امید اور مرکز نظر بن گیا۔ شب و روز بدلتے رہے اور زمانہ کروٹیں لیتا رہا لیکن اس باوقار با رفعت طائفہ میں جاں نثار مخلصین اور بے لوث خادمین کا یکے بعد دیگرے اس طور پر ورود مسعود ہوتا رہا کہ ہر شخص اپنے پیش رو کے ہمالیائی نقش پا کو بوسے دینے کا نہ صرف یہ کہ امتیازی حوصلہ رکھتا تھا بلکہ اپنے نامور اسلاف کے معیار کو برقرار رکھنے کی بھرپور استعداد اور فن کارانہ مہارت بھی۔

ہر شخص اس حقیقت کو بخوبی سمجھتا اور تسلیم کرتا ہے کہ کسی تحریک یا تنظیم کو معیاری سطح پر قائم کر دینا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا کہ ایک طویل عرصے تک اسے نبھانا اور اسی معیار پر قائم رکھنا۔ شبلی کے رفقاء اور تلامیذ نے اس شرف امتیاز کو تقریباً ایک صدی تک نبھا کر اور برقرار رکھ کر نہ صرف یہ کہ اس بات کو ثابت کر دیا کہ مادیت کی بیشی اور وقت کے نشیب و فراز کے باوجود اگر اپنے مشن کے تئیں بھرپور حوصلہ اور لگن ہو اور اپنے رہنما کے ساتھ خلوص و ایثار قائم رہے تو ہر مشکل آسان ہے اور ہر منزل قریب ہے۔

دار المصنفین کو ہر زمانے میں مستند علمی و ادبی لیاقت رکھنے والے مخلص، ایماندار، جاں نثار، کارگزار اہل اور باصلاحیت رفقاء کار کی خدمات اعزازی اور رضا کارانہ طور پر یا برائے نام معاوضہ پر حاصل ہوتی رہیں

جن کا مختصراً جائزہ حسب ذیل ہے :

۱- مولانا حمید الدین فراہی رشتہ داری کے لحاظ سے مولانا شبلی سے ممیرے پھوپھیرے بھائی کا رشتہ رکھتے تھے - اردو فارسی اور عربی علم وادب پر کامل دسترس حاصل تھی ، ساتھ ہی ساتھ گریجویٹ ہونے کی حیثیت سے مغربی علوم وافکار کو بھی بخوبی سمجھتے تھے - قرآنی علوم پر عبور حاصل تھا اور معنی و مطالب اور تفسیر پر بڑی بصیرت افروز نظر رکھتے تھے - ان کے قدردانوں میں مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام خصوصیت سے لئے جا سکتے ہیں - درس وتدریس اور تصنیف وتالیف تمام زندگی ان کا مشغلہ رہا - ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے - مختلف دینی و دنیاوی مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے - 1897 میں مدرستہ الاسلام کراچی میں تدریسی خدمات انجام دیں - 1908 میں الہ آباد یونیورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے - 1910 میں سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں مدرستہ الاصلاح قائم کیا اور اس مدرسے کے مہتمم اول مقرر ہوئے - مولانا شبلی اپنی زندگی کے آخری ایام میں جن لوگوں کو اپنے قریب دیکھنا چاہتے تھے اور جن پر بے حد اعتماد کا اظہار کرتے تھے ان میں خصوصیت سے مولانا فراہی اور سید صاحب کے نام لئے جا سکتے ہیں اور واقعی شبلی کے اس حسن ظن کو مولانا فراہی نے ان کے انتقال کے بعد اپنی گراں قدر خدمات سے سچ ثابت کیا - الغرض شبلی مشن کے لئے ایک نہایت مستند اور باصلاحیت معنوی فرزند ثابت ہوئے - 1914 کے اواخر میں مولانا شبلی کے انتقال کے بعد ان کے مخلص شاگردوں اور قدردانوں کی ایک تنظیم 'اخوان الصفا' کے نام سے قائم کی جس کا مقصد مولانا شبلی کے نامکمل مشن کی تکمیل تھی - اس مجلس نے دارالمصنفین کے صدر کی حیثیت سے ان کو بحال کیا اور اس منصب کی ذمہ داریوں کو وہ تا زندگی انجام دیتے رہے - 1915 میں جامعہ عثمانیہ کے صدر الصدور مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے اصرار پر حیدرآباد چلے گئے اور جامعہ عثمانیہ سے اور محکمہ تعلیمات ریاست حیدرآباد سے منسلک رہے - جہاں بھی رہے تصنیف وتالیف کے کام میں لگے رہے - عربی صرف ونحو اور تفسیر پر قابل قدر کتابیں لکھیں - 1919 سے لیکر 1930 میں اپنے انتقال تک مدرستہ الاصلاح اور دارالمصنفین سے متعلق مختلف خدمات انجام دیتے رہے -

۲- سید سلیمان ندوی بلند پایہ عالم دین ، یگانہ روزگار محقق ، جلیل القدر صحافی ، عہد آفریں ادیب وخطیب ، قادر الکلام شاعر ، ممتاز ماہر تعلیم ، مثالی معلم ، عظیم سیرت نگار ، بے لوث رہبر ملت ، تاریخ ساز جاں نثار اسلام ، محبت نبی میں سرشار عاشق رسول اور صاحب نسبت روحانی بزرگ - بقول علامہ اقبال: "سید صاحب علم کی جوئے شیر کے فرہاد تھے -" [11] وہ دارالمصنفین کے ایسے روح رواں تھے کہ اگر انھیں مجسم دارالمصنفین

کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔ دارالمصنفین کو اپنے خون جگر سے سینچنے والی اور معارف کو متحرک اور فعال رکھنے والی اور ان دونوں کو زندۂ جاوید بنانے والی اگر کوئی شخصیت ہے تو سید سلیمان ندوی ہیں ۔ شبلی کی جانشینی کا نہ صرف یہ کہ انھوں نے حق ادا کر دیا بلکہ ان کے مشن کو اوج کمال تک پہونچانے میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ۔ مہدی حسن افادی انھیں بجا طور پر "سید الطائفہ" کہا کرتے تھے [12] اور بقول شاہ معین الدین ندوی "وہ قدیم و جدید کا سنگم تھے" [13]

22 نومبر 1884 کو صوبہ بہار میں نالندہ ضلع کے مردم خیز اور علم دوست گاؤں دیسنہ میں خاندانی سادات کے ایک مقتدر گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ 1901 میں دارالعلوم ندوہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے ۔ 1907 میں 'الندوہ' کے سب ایڈیٹر بحال ہوئے ۔ 1913 میں مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' سے وابستہ ہوگئے اور اسی سال دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے ۔ مولانا شبلی کی دوررس نگاہیں شروع ہی سے اس جوہر کمال کو پہچان چکی تھیں اور اپنے زیر تربیت رکھکر تالیف و تصنیف کے فن میں طاق کردیا تھا ۔ مولانا شبلی نے ان کو اپنے انتقال سے پہلے سیرت النبی کے ادھورے کام کو مکمل کرنے کی سختی سے ہدایت اور وصیت کی تھی ۔ اپنے نامور استاد کی وفات کے بعد انھوں نے تین ایسے اہم کام انجام دئے جن کا خصوصیت سے یہاں ذکر ضروری ہے:

۱ ۔ 1915 میں دارالمصنفین کی تشکیل اپنے استاد محترم کے مرتب کئے ہوئے خاکے کے مطابق کیا اور اس ادارے کے پہلے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے ۔

۲ ۔ 1916 کے رمضان المبارک میں ماہنامہ معارف کا پہلا شمارہ اپنی ادارت میں نکالا اور ادارت کے فرائض ایک طویل عرصہ تک نہایت ذمہ داری کے ساتھ معیاری نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انجام دیتے رہے

۳ ۔ سیرت النبی ؐ کی آخری چار جلدیں مرتب کیں ۔

سید صاحب خالصتاً علمی ذوق رکھنے والے آدمی تھے مگر اپنے زمانے کی قومی و ملی تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہے اور وقتاً فوقتاً مختلف ذمہ دار تنظیموں کی طرف سے مسلم ممالک میں بھیجے گئے وفود کی سربراہی کی اہم خدمات کو بھی انجام دیتے رہے ۔ بحیثیت ماہر تعلیم ذمہ دارانہ خدمات کو بھی انجام دیتے رہے مثلاً 1933ء میں کابل یونیورسٹی کا خاکہ تیار کرنے کے لئے شاہ افغانستان نادر خان کی دعوت پر علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ہمراہ کابل تشریف لے گئے اور ۱۹۵۰ء میں پاکستان کا دستور بنانے کے سلسلے میں ادارہ تعلیمات اسلام کے بورڈ کے چیرمین مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۱ء میں آپ کی وسیع اور گوناگوں علمی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اور آپ کی گراں قدر خدمات کو سراہتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا ۔ ۱۹۵۰ء میں آپ ترک وطن کرکے پاکستان چلے گئے اور 22 نومبر 1953 کو

کراچی میں وفات پائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ شبلی مشن یا ندوہ تحریک کی سب سے بہتر پیداوار قدیم و جدید کے درمیان ایک ہر دل عزیز سفیر علامہ سید سلیمان ندوی کی ذات تھی جو ملّا اور مسٹر دونوں حلقہ ہائے فکر و نظر میں محبوب، دونوں کے طرز ادا سے آشنا، دونوں کی مجلسوں میں یکساں بے تکلف، جس نے لندن کا سفر کیا، کعبہ کا طواف کیا، پیرس کی سیر کی، مدینہ منورہ میں حاضری دی، جو جون ڈی آرک کی یادگار دیکھ کر متاثر ہوا اور روضۂ اقدس پر پہنچ کر بے اختیار جس کی زبان پر جاری ہو گیا:

اے طائر بیت نبویؐ یاد رہے یہ + بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز + خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج + جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے

سید صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ ارض القرآن ۔ ۲ جلدیں جلد اول سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا ہوئی تھی۔ پہلی جلد 1915 میں اور دوسری 1918 میں شائع ہوئی۔

۲۔ سیرت النبیؐ ۔ ۴ جلدیں 1918 اور 1920 میں مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ جلد اول اور جلد دوم کی نوک پلک درست کرکے اپنی خصوصی نگرانی میں شائع کروانے کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد علی الترتیب 1924، 1932، 1933 اور 1939 میں بقیہ چار جلدیں شائع ہوئیں۔ پانچویں جلد کے شائع ہوتے ہوتے اس کتاب کی مقبولیت اتنی زیادہ بڑھ چکی تھی کہ ہر ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ چھٹی جلد اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے اور سیرت کے سلسلے کی اہم تصنیف ہے۔

۳۔ سیرت عائشہؓ ۔ 1920 میں شائع ہوئی۔

۴۔ خطبات مدراس ۔ 1914 میں MUSLIM EDUCATIONAL ASSOCIATION OF SOUTHERN INDIA کی دعوت پر سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر 8 خطبات ارشاد فرمائے جو بعد میں خطبات مدراس کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ خطبات اپنے مضامین، جامعیت، ادب و انشا اور زور خطابت کے لحاظ سے اردو ادب کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ LIVING PROPHET کے نام سے ان کا انگلش ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

۵۔ عرب و ہند کے تعلقات ۔ 1929 میں سید صاحب ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد میں عرب و ہند کے تعلقات پر لکچرز دینے کے لئے مدعو کئے گئے۔ یہ لکچرز تلاش و تحقیق، محنت و کاوش اور جدت و استدلال کے اعتبار سے بے مثال سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد سے کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔

۶۔ خیام ـــ 1933 میں سید صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف خیام شائع ہوئی جس نے عمر خیام کی شخصیت کو ایک نئے رنگ میں ظاہر کیا۔ اس تصنیف کو خوب داد تحسین حاصل ہوئی بالخصوص برصغیر اور افغانستان و ایران کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کو خوب سراہا گیا۔ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دئے ان میں ایک تحفہ 'خیام' بھی تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس کتاب پر پانچ سو روپئے کا انعام دیا۔ ڈاکٹر اقبال نے اس کتاب کو پڑھکر سید صاحب کو لکھا "عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔"[12]

۷۔ نقوش سلیمانی ـــ ان خطبوں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق سید صاحب کے قلم سے نکلے ہیں۔ یہ گویا گذشتہ 25 سال کی ادبی تحریکوں کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس لئے ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ 1939 میں شائع ہوئی۔

۸۔ رحمت عالم ـــ ۱۹۴۰ میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک شائع کی۔

۹۔ حیات شبلی ـــ 1943 میں 846 صفحات پر مشتمل حیات شبلی لکھ کر اپنے استاد کو خراج عقیدت پیش کی۔ یہ ضخیم کتاب محض ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس برسوں کی علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے۔ اس پر ہندوستانی اکیڈمی نے پانچ سو روپئے کا انعام بھی دیا۔

۱۰۔ حیات امام مالک

۱۱۔ عربوں کی جہاز رانی

۱۲۔ لغات جدیدہ

۱۳۔ خطبات شبلی

۱۴۔ مکاتیب شبلی ۲ جلدیں

۱۵۔ مقالات شبلی ۸ جلدیں مذہبی + ادبی + تعلیمی + تنقیدی + تاریخی ۲ جلدیں + فلسفیانہ + قومی
1930 1931 1932 1934 1936 اور 1937 1938 1938

---

[11] اورنگ سلیمان ـــ پروفیسر سید فخر الحسن ماخوذ از ڈاکٹر سید عبداللہ کا مکتوب سید صاحب کی صد سالہ جشن ولادت کی تنظیم کے نام

[12] مکاتیب مہدی افادی ـــ مرتبہ مہدی بیگم صفحہ ۱۲۰ مکتوب بنام مولوی عبدالباری ندوی

[13] حیات سلیمان ـــ شاہ معین الدین ندوی صفحہ ۶۸

[14] سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات ـــ نذیر حسین صفحہ 115

۳۔ مولانا عبدالسلام ندوی دارالمصنفین کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے اور سید سلیمان ندوی کے دست راست کی حیثیت سے انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ دارالمصنفین کے قیام سے لیکر اپنی وفات تک وہ اس ادارہ سے منسلک رہے اور اسی خاک کا پیوند بن گئے۔ 1882 میں موضع علاؤالدین پٹی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ندوۃ العلماء کے سعادت مند سپوتوں میں سے ایک تھے۔ ندوہ سے تعلیم کی تکمیل کے بعد 1910 میں ندوہ ہی میں عربی ادب کے استاد مقرر ہوگئے۔ 1912 میں الہلال سے وابستہ ہوئے اور 1915 سے اپنے انتقال کی تاریخ 4 اکتوبر 1956 تک دارالمصنفین کے رکن رکین کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا کی تصنیفات کا جائزہ حسب ذیل ہے:

۱۔ اسوۂ صحابہ ۲ جلدیں — دارالمصنفین کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

۲۔ اسوۂ صحابیات — اس کتاب میں ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے اخلاق و معاشرت کے متعلق مؤثر واقعات ہیں۔

۳۔ سیرت عمر ابن عبدالعزیز — اس کتاب میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی عادلانہ حکومت اور فقیرانہ زندگی کے واقعات اتنے زیادہ دل پذیر انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ مسلمانوں کے ایمان میں تازگی اور غیر مسلموں میں اسلام کی عظمت کا نقش قائم ہوجاتا ہے۔

۴۔ شعرالہند ۲ جلدیں — مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات کے بعد شعرالہند اردو شعراء کا پہلا جامع تذکرہ ہے جس میں اردو شاعری کے تمام رخ سامنے آجاتے ہیں۔ اس کتاب نے برصغیر میں اردو شاعری سے متعلق ذوق بنایا ہے۔ ہند و پاکستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔

۵۔ انقلاب الامم — یہ کتاب مشہور فرانسیسی عالم و مفکر گستاولی بان کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں نفسیاتی اصول اور اخلاقی قوانین کی تشریح کی گئی ہے جن سے قوموں کی ترقی اور تنزلی وابستہ ہے۔ یہ کتاب بھی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔

۶۔ تاریخ فقہ اسلامی — یہ فقہ اسلامی کی مکمل تاریخ ہے اور مصری عالم محمد خضری کی کتاب "التشریع الاسلامی" کی تلخیص ہے۔

۷۔ ابن خلدون — مصر کے نامور فاضل ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۸۔ القضاۃ فی الاسلام — اس میں اسلام کا نظام عدالت ہے۔

۹۔ امام رازی — اس میں امام فخرالدین رازی کی تصانیف پر تبصرہ اور ان کے فلسفہ، علم کلام اور نظریات و خیالات کی تشریح ہے۔

۱۰۔ اقبال کامل — یہ کتاب اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور جن معلومات کے لئے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے وہ اس میں یکجا طور پر مل جاتے ہیں۔

۱۱۔ حکمائے اسلام — اس میں مکمل تاریخ اسلام ہے۔

۴۔مولانا مسعود علی ندوی دارالمصنفین میں انتظام کاری اور نظم و ضبط سے متعلق خدمات انجام دیتے رہے یہاں تک کہ اسی خاک کا پیوند بن گئے ۔ دارالمصنفین کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ موضع بھیارہ ضلع بارہ بنکی وطن تھا۔ شاہ معین الدین ندوی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی خدمات کو سراہا ہے " دارالمصنفین کو پروان چڑھانے میں دونوں کا حصہ ہے' سید صاحب اگر اس کی روح تھے تو مولانا مسعود علی ندوی جسم۔ سید صاحب کی ذات سے ہندوستان اور بیرون ہند میں دارالمصنفین کی علمی شہرت ہوئی تو مولانا مسعود علی ندوی نے اس کا مقامی وقار قائم کیا اور اس کے انتظامی امور کو سنبھالا " ۔ [15]

۵۔شاہ معین الدین احمد ندوی سید سلیمان ندوی کے جانشین کی حیثیت سے دارالمصنفین کے ناظم اعلیٰ اور معارف کے مدیر دوم کے مناصب پر پچاس برس سے زائد عرصے تک قابل قدر خدمت انجام دی ۔ 1903 میں ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے ۔ قطب عالم شیخ احمد عبدالحق توشہ ردولوی کے عظیم المرتبت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی آستانہ کی خاک کا پیوند بن گئے ۔ ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد 1924 میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے اور دارالمصنفین ہی کی قیام گاہ پر 13 دسمبر 1974 کو انتقال کیا ۔ قلم پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ ایک بار سید صاحب نے معارف کے شذرات میں ان کی تحریر دیکھ کر فرمایا تھا " اب سن اور م میں شاید ہی کوئی فرق محسوس ہو " [16] سید صاحب کی زندگی ہی میں ان کی جانشینی کی خدمت پر مامور ہوئے ۔ پہلی بار اس وقت جبکہ سید صاحب بھوپال تشریف لے گئے تھے اور دوسری بار اس وقت جبکہ سید صاحب پاکستان چلے گئے تھے ۔ مختلف ذمہ دار اور باوقار علمی انجمنوں کے لائق ممبر رہے ' مختلف یونیورسٹیوں میں زبان عربی اور علوم اسلامی کے رکن رہے ۔ حکومت ہند اور حکومت سعودیہ وغیرہ نے مختلف اعزازات سے مشرف کیا ۔ قلم اور زبان کے معاملے میں نہایت موزوں اور متوازن شخصیت تھے ۔ دوست دشمن سبھی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ تصانیف کا جائزہ مندرجہ ذیل ہے :

۱۔سیر الصحابہ جلد ششم و ہفتم 1932 اور 1933 ۲۔مہاجرین جلد دوم 1930 ۳۔تابعین 1937
۴۔تاریخ اسلام جلد اول تا جلد چہارم یہ کتاب ہندو پاک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے ۵۔عرب کی موجودہ حکومتیں 1933
۶۔اسلام اور عربی تمدن ۔ شام کے مشہور فاضل علامہ کرد علی کی کتاب کا ترجمہ ہے ۔ ۷۔دین رحمت ۸۔حیات سلیمان
۹۔ادبی نقوش ۱۰۔انوار العیون فی اسرار المکنون کا اردو ترجمہ اصل کتاب شیخ احمد عبدالحق توشہ ردولوی کے ملفوظات پر مشتمل ہے ۔

---

[15] حیات سلیمان ـــ شاہ معین الدین ندوی ص ۶۷۱

[16] علامہ سید سلیمان ندوی ـــ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ص ۵۱۰

۶۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے عصری علوم میں اسناد حاصل کیں۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد دارالمصنفین اور معارف سے منسلک ہوئے۔ 1935 سے 1943 تک ندوہ میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ 1943 سے 1951 تک ناظم ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ کے منصب پر فائض رہے۔ 1951 سے 1972 تک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ادارۂ دینیات کے ناظم اعلیٰ بن کر رہے۔
تصانیف میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں :

۱۔ ہندوستان کی کہانی ۲۔ ہماری بادشاہی ۳۔ شاہی حکمران ۴۔ دنیائے اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد ۵۔ مسلمان اور وقت کے تقاضے۔

۷۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن 1935 میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہوئے اور 1987 میں انتقال کے بعد ہی اس سے ان کا تعلق منقطع ہوا۔ اس طرح نصف صدی سے بھی زیادہ مدت تک انھیں علم و فن کی خدمت کا موقع ملا۔ 18 نومبر 1987 کو وہ رکشہ سے لکھنؤ کے ڈالی گنج پل پر سے گزر رہے تھے کہ گاڑیوں کی بے ترتیبی اور دھکے سے وہ گر پڑے اور یہ گرنا ان کے حق میں جان لیوا ثابت ہوا۔ انھوں نے 76 برس کی عمر پائی۔ لیکن یہ عمر انھوں نے علم و ادب اور امت اسلامیہ کی خدمت میں بہت مفید ڈھنگ سے گزاری۔ صوبہ بہار کے نالندہ ضلع میں بہار شریف سے تقریباً دس بارہ کیلومیٹر کے فاصلے پر پنچانن ندی کے کنارے صوبہ بہار کی مردم خیز بستی دیسنہ کے رہنے والے تھے جو کئی سو برس سے دینی و دنیاوی تعلیم کی ترقی کے معاملے میں مشہور ہے۔ سید صباح الدین اپنے پیش رو بزرگوں کی مانند ممتاز دینی درس گاہوں کے فارغ نہیں تھے بلکہ پٹنہ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ تھے۔ وہ دنیا سے کیا گئے کہ اپنے ساتھ دارالمصنفین کے ماضی کی عظمت بھی سپرد خاک کر گئے۔ بہت ہی خلیق، وضع دار، ملنسار، با مروت اور مہمان نواز تھے۔ کاملان علم و ادب اور تشنگان فکر و فن کی بڑی قدردانی و پذیرائی فرماتے تھے۔ انھیں خوبیوں کے وجہ کر ان کے واقف کاروں اور مداحوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ڈاکٹر محمد طاہر لکھتے ہیں "قدرت نے جہاں ان کو تصنیف و تالیف کی صلاحیتیں عطا کی تھیں وہاں بے پناہ انتظامی اور معاملہ فہمی کی صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ ہر چیز پر ان کی نظر رہتی تھی۔ عمارت کی تعمیر و مرمت، باغ کے درختوں کی دیکھ بھال، پھلوں کی فروخت، لان اور پھولوں کی نگہداشت، پریس مشین اور ملازمین کی کارکردگی پر نگاہ رکھنا، معارف کے لئے شذرات قلم بند کرنا، شائع ہونے والے مضامین کا مطالعہ کرنا، کتابت و طباعت کی نگرانی، مسودات کی پروف ریڈنگ، موصولہ خطوط کا پابندی سے جواب دینا، آنے والوں سے ملنا اور جانے والوں کو

رخصت کرنا یہ سب ان کے معمولات و مشاغل میں شامل تھا۔ باوجودیکہ عمر طبعی کو پہونچ چکے تھے لیکن اپنی صحت، دماغی کیفیت، یادداشت، بینائی وغیرہ کے معاملے میں ہر طرح توانا و تندرست تھے۔ جسم سے بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے لیکن خیال، ارادہ، انداز فکر اور قوت عمل سے بڑھتی ہوئی جوانی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ محنت اور پیش آمدہ مسائل سے نہ کبھی گھبرائے نہ بددل ہوئے۔ اتنی ہما ہمی اور مشغولیت کے باوجود دارالمصنفین کا کوئی معمولی یا غیر معمولی کام ایسا نہ ہوتا جو وقت پر پورا نہ ہوتا یا تشنۂ تکمیل رہ جاتا۔ ان کی جو کرسی دارالمصنفین پر حاوی تھی۔ اگر ماہنامہ معارف کی اشاعت وقت پر نہ ہو پاتی یا تاخیر کا امکان ہوتا تو بے حد پریشان رہتے اور برابر ہدایت دیتے رہتے کہ اشاعت وقت پر ہو۔ میں نے مرحوم کو ہمیشہ ان کے رہائشی مکان کے برآمدے میں یا دفتر کی کرسی پر بیٹھے اور لکھتے ہوئے پایا۔ جیسے جیسے ان کی عمر آگے کھسکتی گئی ان کے اشہب قلم پر شباب آتا گیا اور رفتار خامہ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔" ؎ سید صباح الدین ہندوستان کی بیشتر علمی و ادبی اور مذہبی تنظیموں کے چیئرمین اور ممبر رہے، مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے ان کی خدمات کو سراہا اور وقتاً فوقتاً انعامات اور ایوارڈز سے نوازتے رہے۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کا انبار لگادیا۔ اردو فارسی زبان و ادب پر تو دسترس رکھتے ہی تھے، انگریزی میں بھی مقالات اور کتابیں لکھیں اور تراجم کیے۔ ان سے متعلق مندرجہ ذیل مطبوعات کا ذکر ضروری ہے:

۱۔ بزم تیموریہ ۳ جلدیں
۲۔ بزم صوفیہ
۳۔ بزم مملوکیہ
۴۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک
۵۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام
۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے
۷۔ ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر
۸۔ بزم رفتگاں ۲ جلدیں
۹۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں۔
۱۰۔ اسلام میں مذہبی رواداری
۱۱۔ امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری
۱۲۔ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری
۱۳۔ سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات
۱۴۔ عہد مغلیہ میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات
۱۵۔ ظہیر الدین محمد بابر ہندو اور مسلمان مورخین کی نظر میں
۱۶۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں ۲ جلدیں
۱۷۔ ہندوستان کے مغل حکمرانوں کی مذہبی رواداری ۲ جلدیں
۱۸۔ سید سلیمان ندوی کی تصنیفات پر ایک نظر
۱۹۔ دیوان اشرف علی خان
۲۰۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں
۲۱۔ ڈاکٹر سید محمود
۲۲۔ مولانا محمد علی

؎ رسالہ نیا دور 'یاد رفتگاں نمبر' مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء مضمون سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی یاد میں ـــــ ڈاکٹر محمد…

انگریزی تراجم ——— ۱۔ عالمگیر از علامہ شبلی ۲۔ ضیاء الدین برنی

۳۔ ہندوستان کے ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی مسلمانوں کے عہد میں از سید سلیمان ندوی

۴۔ جہانگیر از علامہ شبلی ۵۔ عربوں کی جہاز رانی از سید سلیمان ندوی

۶۔ خواتین اسلام کی بہادری از سید سلیمان ندوی

۷۔ GLORIES OF INDO PERSIAN LITERATURE

۸۔ AMIR KHUSRO A GINIOUS

اس کے علاوہ ملک اور غیر ممالک کے موقر انگریزی کا جریدوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی ذات میں وہ خود ایک بزم اور انجمن تھے۔

؎ برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ سے آنکھیں + تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

۸۔ مولانا ابوالحسنات ندوی ان کا شمار بھی دارالمصنفین کے ابتدائی دور کے رفقاء میں ہوتا ہے۔ 34 برس کی عمر میں عین جوانی میں انتقال فرما گئے۔ صوبہ بہار کے موضع اشرف پورہ ضلع نالندہ میں 1890 میں پیدا ہوئے اور 1924 میں وہیں انتقال کیا۔ ندوہ کے فارغین میں تھے۔ 1918 سے زندگی کے آخری ایام تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔ معارف کے ابتدائی دور کے اہل قلم حضرات کے زمرہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ صرف کتاب 'ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں' لکھنے پائے تھے کہ پیام اجل آ پہونچا۔ رقعات عالمگیری کی تزئین و ترتیب کا کام کر رہے تھے مگر وہ نامکمل رہ گیا۔ گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ بہترین ادیب اور اردو و فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

۹۔ مولانا سعید انصاری ان کا شمار بھی دارالمصنفین کے ابتدائی دور کے رفقاء میں ہوتا ہے۔ ندوہ کے فارغین میں تھے۔ دارالمصنفین اور دوسرے اداروں سے وقتاً فوقتاً وابستہ رہے۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے اور لاہور یونیورسٹی میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے اسٹاف میں شامل ہوگئے۔ دارالمصنفین سے ان کی ایک کتاب سیر الانصار کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ چند اور کتابوں کے بھی مصنف ہیں جو دوسری جگہوں سے شائع ہوئے ہیں۔

۱۰۔ سید نجیب اشرف ندوی 1921 سے 1930 تک ۱۰ برس دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔ سید صاحب کے ہم وطن تھے۔ دارالمصنفین نے ان کو مولانا ابوالحسنات ندوی کے نامکمل کام کی تکمیل پر مقرر کیا۔ چنانچہ رقعات عالمگیری کی ایک جلد مرتب کی۔ بعد میں مقدمہ رقعات عالمگیری کے نام سے ایک اور کتاب شائع کی۔ یہ کتابیں تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ادب و انشاء کے بہترین نمونوں کو منظر عام پر لاتی ہیں۔ معارف کے ابتدائی دور

کے اہم صاحبان قلم میں سے ایک سید نجیب اشرف ندوی بھی ہیں جو تلخیص وتبصرہ اور اخبار علمیہ کے عنوانات سے لکھتے تھے ۔

۱۱- مولانا عبدالباری ندوی ان کا شمار بھی دارالمصنفین کے دور اول کے رفیقوں اور مصنفوں میں کیا جاتا ہے لیکن دارالمصنفین میں ان کے قیام کی مدت بہت کم یعنی تقریباً دو برس رہی ۔ اس کے بعد وہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوگئے مگر دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن رکین کی حیثیت سے ان کے ارتباط اس ادارہ سے برقرار رہے ۔ موصوف بارہ بنکی کے رہنے والے تھے ۔ فروری 1976 میں لکھنؤ میں انتقال ہوا ۔ دارالمصنفین کی نگرانی میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں :

۱- برکلے اور اس کا فلسفہ ۲- مبادی علم انسانی ۳- فہم انسانی یہ کتاب ڈیوڈ ہیوم کی HUMAN UNDERSTANDING کا ترجمہ ہے ۔

دوسرے اشاعتی اداروں سے ان کی شائع ہونے والی کتابوں میں مندرجہ ذیل لائق تذکرہ ہیں :

۱- مذہب اور سائنس ۲- علم نباتات ۳- علم اخلاق ۴- اخلاقیات ۵- مابعد الطبعیات
۶- طریق اور تفکرات ۷- طریقہ نفسیات ۸- تجدید تصوف وسلوک ۹- تجدید تعلیم وتبلیغ
۱۰- تجدید معاشیات ۱۱- تعمیر صلاح وفلاح ۱۲- جامع المجددین

۱۲- مولانا ریاست علی ندوی 1924 سے 1947 تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے ۔ دارالمصنفین کے زیر انتظام ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں : ۱- تاریخ صقلیہ ۲ جلدیں 1936 میں ۲- تاریخ اندلس

دوسرے اشاعتی اداروں سے ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں : ۱- عہد اسلامی کا ہندوستان ۲- ائمۂ اسلام ۳- اسلامی نظام تعلیم ۴- سرگذشت ادب ترکی ۔

مولانا موصوف کا وطن گیا صوبہ بہار تھا ۔ کچھ عرصہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل رہے ۔ اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی عربی وفارسی کے شعبہ ریسرچ میں معاون کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۔ 1976 میں بہار میں انتقال کیا ۔

۱۳- مولانا ابوظفر ندوی 1935 سے 1939 تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے ۔ دارالمصنفین کے زیر انتظام ان کی ۳ کتابیں شائع ہوئیں : ۱- تاریخ ہند ۲- تاریخ سندھ ۳- تاریخ تمدن گجرات

دوسرے اشاعتی اداروں سے ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں :

۱- تاریخ خاندان غزنیہ ۲- تاریخ گجرات ۳- تاریخ اولیائے گجرات ۴- سفر برما
۵- بمبئی بول چال ۶- تذکرہ محمد بن طاہر محدث پٹنی ۷- منتخبات اردو

۸۔ فرہنگ اصطلاحات ۹۔ جدید تعلیم اردو

مولانا موصوف سید صاحب کے ہم وطن تھے ۔ بہت عرصہ تک احمد آباد میں قیام پذیر رہے اور گجرات کی تاریخ پر بڑا عبور رکھتے تھے ۔ 1958 میں انتقال کیا ۔

۱۴۔ مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی 1949 میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے اور تقریباً ۱۹ سال تک اس ادارہ کی رفاقت کا شرف حاصل کیا ۔ غازی پور کے رہنے والے تھے ۔ دارالمصنفین کے زیر انتظام ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں : ۱۔ اہل کتاب صحابہ ۲۔ تابعین وتبع تابعین
کسی دوسری جگہ سے ان کی ایک کتاب قانون فقہ اسلامی بھی شائع ہو چکی ہے ۔

۱۵۔ مولانا حاجی معین الدین ندوی دارالمصنفین کے ابتدائی دور کے رفقاء میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ سید صاحب کے پڑوسی گاؤں استھاواں ضلع نالندہ کے رہنے والے تھے ۔ کچھ دنوں امپیریل لائبریری کلکتہ سے منسلک رہے ، کچھ عرصہ خدابخش لائبریری پٹنہ سے وابستہ رہے ، کچھ دنوں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے بھی منسلک رہے ، کچھ عرصہ اسٹیٹ لائبریری رامپور میں خدمات انجام دیں ، سب سے آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پرنسپل مقرر ہوئے اور یہیں ۱۹۷۱ میں انتقال کیا ۔ دارالمصنفین کے زیر انتظام دو کتابیں شائع ہوئیں ۱۔ خلفائے راشدین ۲۔ مہاجرین
مولانا کی دوسری کتابوں میں مندرجہ ذیل کا شمار ہوتا ہے : ۱۔ معجم الامکنہ ۲۔ فہرست مخطوطات کتب خانہ بانکی پور

۱۶۔ مولانا ابو الجلال ندوی اعظم گڑھ کے رہنے والے ، عربی کے علاوہ مختلف قدیم زبانوں کے ماہر ، معارف کے قلم کاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے ، لسانیات اور فن آثار قدیمہ کے ماہر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ۔

۱۷۔ ڈاکٹر محمد عزیر موضع بی بی پور اعظم گڑھ کے رہنے والے ، ۸ برس دارالمصنفین کے رفیق رہے ۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ اردو میں لکچرر بحال ہوئے ۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان چلے گئے ۔ دارالمصنفین کے زیر انتظام ان کی ایک کتاب تاریخ دولت عثمانیہ ۲ جلدیں شائع ہوئیں ۔ ان کی دیگر تصانیف میں اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ ہے ۔

۱۸۔ مولانا محمد نعیم صدیقی ندوی اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں ۔ ندوہ سے فراغت کے بعد دارالمصنفین میں ناظم کتب خانہ مقرر ہوئے ، پھر رفیق کی حیثیت حاصل ہوئی ۔ ملک کے معیاری رسائل اور جریدوں میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ دارالمصنفین کی زیر نگرانی تبع تابعین کی دوسری جلد شائع ہوئی ۔

۱۹۔ مولانا محمد یوسف کوکن کچھ عرصہ سید صاحب کے ساتھ دارالمصنفین میں تصنیفی کوششوں میں لگے رہے ۔

بعد میں ابن تیمیہ پر ان کی کتاب شائع ہوئی۔

۲۰-مولانا محمد اویس نگرامی ندوی دارالمصنفین کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر اور معارف کی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے۔ سات سال دارالمصنفین میں خدمات انجام دینے کے بعد ندوہ میں شیخ التفسیر کے منصب عالیہ پر فائض ہوئے۔ قرآنی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ دارالمصنفین کی زیر نگرانی تفسیر ابن القیم شائع ہوئی۔ معارف میں قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات سے متعلق مضامین لکھتے رہے۔ موضع نگرام ضلع لکھنو کے رہنے والے تھے۔ 1976 میں انتقال کیا۔

۲۱-مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوہ سے فراغت کے بعد 1976 سے یعنی تقریباً 25 برس سے دارالمصنفین میں رفیق کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ فقہائے اربعہ اور دیگر فقہ مثلاً فقہ جعفریہ وغیرہ پر کام کر رہے ہیں۔ معارف میں مضامین لکھتے ہیں۔ تحقیق، ترجمے، وفیات اور تبصرہ وغیرہ سے متعلق کاموں کو انجام دیتے ہیں۔

۲۲-شاہ نصیر احمد پھلواروی خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ کی عظیم المرتبت ہستی مولانا شاہ عون احمد قادری کے صاحب زادے ہیں۔ بحیثیت رفیق مختلف تحقیقی کاموں میں مصروف تھے۔

۲۳-مولوی محمد منصور نعمانی ندوہ کی فراغت کے بعد ۱۹۷۷ سے دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے 'علمائے ہند' کے موضوع پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ بھوپال کے رہنے والے ہیں۔

۲۴-مولوی محمد عارف عمیری دارالمصنفین کے دورحال کے سرگرم رفقاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

۲۵-مولانا ضیاء الدین اصلاحی موضع سہریا ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے دارالمصنفین کے موجودہ 'ناظم اعلیٰ' اور حلقۂ دارالمصنفین کی معتدد شخصیت ہیں۔ معارف کی ادارت کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد ہے۔ مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد سے دارالمصنفین سے منسلک ہوئے، شروع میں رفاقت اور بعد میں نظامت و ادارت کے مناصب عالیہ پر مقرر ہوئے۔ معارف اور معیاری جرائد میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حسب ذیل کتابوں کے مصنف ہیں:

۱- تذکرۃ المحدثین ۲ جلدیں ۲- ہندوستان عربوں کی نظر میں ۲ جلدیں وغیرہ

رفقاء کی یہ فہرست اس لحاظ سے مکمل نہیں ہے کہ اس میں متعدد ایسے اہل قلم شامل نہیں کئے گئے جو مختصر عرصے کے لئے دارالمصنفین سے وابستہ ہوکر واپس چلے گئے لیکن یہ فہرست بایں طور کافی ہے کہ اس میں مشہور رفقاء کا ذکر آگیا ہے۔

دارالمصنفین کے مختلف شعبہ جات میں انتظام کاروں اور کارگزاروں کے حلقہ سے مندرجہ ذیل اشخاص

سے متعارف کرانا بھی ضروری ہے : مولوی عبدالباری + جناب مجید زبیری + جناب عبدالمنان ہلالی
موخرالذکر دو حضرات شبلی نیشنل کالج کے ممتاز اساتذہ میں شمار ہوتے تھے ۔ وظیفہ یابی کے بعد انھوں نے اپنی خدمات دارالمصنفین کے لئے پیش کیں ۔ جناب زبیری اعظم گڑھ کی ثقافتی و شعری دنیا میں خاص امتیاز کے حامل تھے علی گڑھ میں انتقال ہوا ۔ عبدالمنان ہلالی اس وقت دفتر میں جوائنٹ سکریٹری کے منصب پر فائز ہیں ۔ ان کے مضامین رسالہ معارف میں بھی شائع ہوتے ہیں ۔

دارالمصنفین کے شعبہ علمی کے علاوہ کتب خانہ، دفتر، دارالاشاعت اور دارالطباعت وغیرہ میں بھی بعض ایسی ہستیاں موجود تھیں جن کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا : ۱۔ جناب یحیی اعظمی ۲۔ مولوی عبدالباری معروف ابوعلی اعظمی ۔ یحیی اعظمی بہترین صاحب طرز شاعر تھے ۔ دارالمصنفین کے آفس انچارج تھے ۔ ان کے کلام کے تین مجموعے نوائے حیات، نوائے پریشاں اور نوائے عصر موجود ہیں ۔ عبدالباری صاحب کے مضامین ملک کے رسائل میں کثرت سے چھپتے رہے ۔ سید سلیمان ندوی کے متعلق ان کے مضامین کا ایک مجموعہ پاکستان سے شائع بھی ہوا ۔ یہ پروف ریڈر کی حیثیت سے نصف صدی سے زیادہ دارالمصنفین کی خدمت میں مصروف رہے ۔ مشہور ناقد و شاعر جناب خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی کتاب مضامین نو کا انتساب ان کے نام سے کرتے ہوئے یہ مصرعہ لکھا تھا : بنادیا حسن کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دارالمصنفین کے انتظام کاروں کا تذکرہ **مولانا سید ابوالحسن علی ندوی** کے ذکر خیر کے بغیر ادھورا کہا جائے گا لیکن ان کی شخصیت سازی خود ایک مقالے کی متقاضی ہے لیکن اس تفصیل کی گنجائش نہ پانے کے سبب بطور رسمی تعارف چند سطور پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ موصوف اس وقت عالمگیر شہرت کے مالک ہیں، مسلم ممالک میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اعلی ہیں ۔ دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر نشین ہیں، معارف کی موجودہ مجلس ادارت کے اولین رکن ہیں، اندرون ملک اور بیرون ملک بے شمار اداروں اور تعلیمی مراکز کے رکن ہیں، رابطہ عالم اسلامی کے لائف ممبر ہیں، بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں جن میں **تاریخ دعوت و عزیمت** کا سلسلہ خصوصی شہرت کا حامل ہے ۔ حضرت سید احمد شہید کے خاندان کے نواسے ہیں اور دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی وطن ہے، ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو صوفیاء، اہل اللہ اور صاحبان کمال کا گڑھ سمجھا جاتا ہے ۔ ان کی بیشتر کتابوں کے تراجم ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہو چکے ہیں ۔ موصوف عربی زبان کے عدیم المثال اسکالر، اسلامی علوم کے جید عالم اور بے مثال خطیب ہیں ۔ قلم اور زبان دونوں پر ملکہ حاصل ہے ۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری سے خلافت حاصل ہے ۔ ساری دنیا میں موصوف کے قدر دانوں کی تعداد بے شمار ہے ۔ موجودہ ہندوستان میں ان سے زیادہ صاحب فضل و کمال کوئی دوسرا نظر نہیں آتا ہے ۔

دارالمصنفین کا دائرہ اثر ملک کے اندر اور ملک سے باہر بہت وسیع ہے ۔ دارالمصنفین کی تحریک سے علمی، ذہنی و قلبی تعلق رکھنے والے ممتاز اہل قلم اور مشاہیر کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے ۔ چند کے نام لکھے جاتے ہیں :

۱- مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا شبلی کو بحیثیت استاد تسلیم کرتے تھے ۔ بے حد معروف العمل اور اصول پسند قلم کار تھے ۔ بیشتر مضامین اور کتابوں کے مصنف تھے ۔ 1977 میں داغ مفارقت دے گئے ۔ دارالمصنفین کے زیر اہتمام ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات اور مولانا محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق ۔

۲- مولانا اقبال احمد خاں سہیل مولانا کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ تھا ۔ چونکہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اس لیے اکثر و بیشتر یہاں تشریف لاتے ۔ شاہ معین الدین صاحب سے قریبی مراسم تھے ۔ "قادر الکلام شاعر، صاحب طرز انشا پرداز، سخن سنج اور سخن فہم تھے" [18] "بڑے لائق، ذہین، طباع اور خوش گفتار تھے ۔ ان کی گفتگو علم و ادب، لطائف و ظرائف کا زعفران زار ہوتی تھی" [19] پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے جو ان کی طبیعت اور فطرت کے بالکل خلاف تھا ۔ مولانا سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں :

ارمغان حرم + تابش سہیل دونوں ان کے کلام کے مجموعے ہیں ۔ کچھ نثری تحقیقات بھی ان سے متعلق ہیں نظم و نثر میں یکساں عبور رکھتے تھے ۔ مولانا کی ایک نظم "ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے" بڑی مقبولیت رکھتی ہے جس کا مندرجہ ذیل شعر بہت مشہور ہے : وہ روئیں جو منکر ہیں حیات شہدا کے + ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے [20]

۳- مرزا احسان بیگ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے ۔ شاعری اور نثر نگاری دونوں پر عبور حاصل تھا ۔ مولانا شبلی کی مطالعت کو شرف و اعزاز سمجھتے تھے ۔ موصوف سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں :

پیام کیف — یہ ان کے کلام کا مجموعہ ہے مقالات احسان — یہ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے

1967 میں انتقال کیا ۔

---

[18] دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات — ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی صہ ۶۷

[19] مقالات احسان — مرزا احسان احمد بیگ صہ ۱۰۰

[20] اقبال سہیل حیات اور شاعری — ڈاکٹر منور انجم صہ ۳۶

۳ دارالمصنفین کا قیام

علامہ شبلی کے خاندان علمی کے اس تذکرہ کے بعد ہم دارالمصنفین کے قیام، طریق کار، مختلف شعبہ جات اور امتیازات و خصائص کا قدرے تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد پھر ہم معارف و متعلقات کے دائرہ گشتی میں داخل ہوں گے۔

۱- قیام کے اسباب ہر متمدن ملک اور قوم کی تاریخ میں مصنفین اور قلم کاروں کو نمایاں اہمیت حاصل رہتی ہے، اس لئے کہ یہی گروہ ایسا ہے جو قومی اور ملکی ضرورتوں کی نشاندہی کرتا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ اپنے قومی مذاق کے مطابق قبولیت کی سطح پر کرتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی ملک میں انقلاب رونما ہوتا ہے یا ہنگامی حالات درپیش ہوتے ہیں تو اس کے پس پردہ فکری اور نظریاتی تانے بانے بننے والے مصنفین اور اہل قلم کی کوششوں کا ایک طویل اور منظم سلسلہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے قلم سے تلوار کا کام لیتے ہیں بلکہ گذشتہ سو ڈیڑھ سو برس سے نظریاتی سیلاب کا ایسا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے کہ قلم تلوار کی بہ نسبت زیادہ موثر ثابت ہو رہا ہے اور "قلم تلوار سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے" (THE PEN IS MIGHTER THAN SWORD) کا مقولہ مکمل طور پر تسلیم شدہ ہے۔ الغرض ملکوں اور قوموں کی سیاسی، تمدنی اور ثقافتی تشکیل میں صاحبان قلم کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کے زمانے میں مسلمانوں کے معاملے میں عربی و فارسی کو معیاری اور مستند زبان سمجھا جاتا تھا اور اس قوم کا تمام تر مذہبی اور فکری سرمایہ انھیں زبانوں میں محفوظ تھا۔ اس وقت عوام میں مقبول زبان اردو تھی جس میں معیاری انداز کی سنجیدہ کتابوں اور ترجموں کا کام گو بالکل مفقود نہ تھا تاہم قوم کے معیار کے لحاظ سے یہ قطعی غیر اطمینان بخش تھا۔ مزید ستم یہ کہ بعض مصنفین اور اشاعتی اداروں نے پست معیار کی کتابیں شائع کرکے اپنا اور زبان کا علمی اعتماد کھو دیا تھا۔ اردو کو ایک طاقتور زبان کی حیثیت سے مروجہ علمی حربہ و ہتھیار سے لیس کرنے کی اور مختلف علوم و فنون کی منتقلی کے ذریعہ اس کے دامن کو انواع و اقسام کے لعل و جواہر سے بھر دینے کی ضرورت تھی۔ علامہ شبلی وقت کے نباض تھے۔ انھوں نے اس ضرورت کو شدت سے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کے حل کے لئے موثر لائحہ عمل پیش کیا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ ملک میں نئی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ پرانی تعلیم اور پرانی قدروں سے بے تعلقی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور چونکہ مسلمانوں کے نامور اسلاف کا تمام تر علمی سرمایہ، ان کے علوم و فنون کی تمام تفصیلات، ان کی تہذیب و ثقافت کے تمام نقوش اور ان

کی روایات اور امتیازات کے تمام تذکرے پرانی الماریوں اور پرانے کتب خانوں کی زینت تھیں جن سے نسل نو کی لسانی اور تمدنی قربت ختم ہوتی جا رہی تھی ۔ اس لئے اس بات کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ بے رخی اور بے اعتنائی بڑھتی رہی تو ہمارے اسلاف نے جن علوم وفنون کو چودہ سو برس کے طویل عرصے میں بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ جمع کیا تھا اور جو شاندار تاریخ دنیا کے سامنے پیش کی تھی شاید اس کا تحفظ ممکن نہ ہو ۔

مولانا شبلی ایک ایسے حلقۂ مصنفین کے قیام کے کوشاں تھے جس کے شرکاء

— ٹھوس علمی صلاحیتوں کے مالک ہوں، جن کی علمی استعداد کا ایک زمانہ معترف ہو یا ان میں درجۂ قبولیت تک پہونچنے کی اہلیت ہو ۔

— اردو زبان وادب پر یہ لوگ خصوصیت سے کامل دسترس رکھتے ہوں ۔

— نئی اور پرانی دونوں روشنیوں سے اکتساب کرنے اور جدید وقدیم دونوں علوم کے ماخذوں سے استفادہ کرنے پر قدرت رکھتے ہوں ۔

— نہ صرف یہ کہ خود تصنیف وتالیف کی مہارت اور تجربہ رکھتے ہوں بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی تربیت دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں ۔

— باذوق، صاحب کردار، محنتی، دیانت دار اور ایثار پسند لوگ ہوں ۔ [21]

یہ لوگ ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کریں جس کے ذریعے

— علم کے قدیم خزانوں سے کھوج کھوج کر جواہرات تلاش کئے جائیں اور ان کو جھاڑ پونچھ کر اور نئی آب وتاب دیکر علم کے بازار کے جوہریوں کے روبرو معائنہ اور ملاحظہ کے لئے پیش کئے جائیں ۔

— دنیا کو مسلمانوں کے نامور اسلاف کے عظیم الشان کارناموں سے روشناس کرانے کا انتظام کیا جائے ۔

— نئی ضرورتوں اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ذہنی سازوسامان کے ذرائع ووسائل فراہم کئے جائیں ۔

— مسلمانوں میں علوم سالفہ کی طرف جو لاعلمی اور بے خبری بڑھتی جا رہی ہے اس جمود وتعطل کو ختم کیا جائے اور شگفتہ ودل نشین انداز میں اور معیاری سطح پر ان کو ان تمام باتوں کی واقفیت کرائی جائے جن سے یا تو ان کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے یا برائے نام رہ گئی ہے ۔

— مسلمانوں کو ان تمام ماخذوں اور سرچشموں سے استفادہ کی آسان صورت پیدا کی جائے جن سے رجوع کرنے اور تحصیل وحصول کرنے کی وہ صلاحیت کھو بیٹھے ہیں ۔

— اسلاف کی متروکہ علمی دولت کو جسے انھوں نے بڑی محنت و جانفشانی کے بعد چودہ سو برس کے طویل عرصے میں جمع کیا تھا ضائع ہونے سے بچایا جائے ۔

— نہ صرف یہ کہ ان علوم و فنون کے تحفظ و بقا کے لئے کوشاں ہوں اور ان کارناموں کے نقوش کو تازہ رکھیں بلکہ ترقی یافتہ قوموں کی مانند ان کی نشو و نما اور فروغ و استحکام کے لئے نئے اصول و ضوابط مرتب کریں اور ان کی نشر و اشاعت اور ترسیل و ترتیب کا انتظام کریں تاکہ علم و فن کے قدر دانوں کو اس سودے کے خریدنے کی طرف رغبت حاصل ہو ۔ [22]

چونکہ مذکورہ بالا اہم کام انفرادی طور پر نہیں ہو سکتے تھے اس لئے اس کی انجام دہی کے لئے ایک ایسے قابل قدر علمی ادارہ کی ضرورت تھی:

- جہاں موضوعات کے انتخاب سے متعلق معاونت کرنے والے لوگ موجود ہوں، مواد کی فراہمی اور دستیابی کا خاطر خواہ انتظام ہو، کتابوں اور علمی ذخیروں سے رجوع کرنے کا معقول انتظام ہو اور تصنیف و تالیف کے مختلف مراحل میں تجربہ کار اور کامل مصنفین اور اہل قلم حضرات سے رہنمائی کے دروازے کھلے ہوں ۔
- ایک ایسا علمی ماحول ہو جو عوامی ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ ہو کر اور دنیاوی منافع و اغراض سے بے نیاز ہو کر فقط قومی ضرورت اور علمی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردے ۔
- ترقی یافتہ قوموں نے اپنے علوم و فنون کی ترویج و ترسیل اور تحفظ و ترتیب کے لئے جس طرح فلاحی اداروں کو قائم کیا ہے اور جس طرح وہ لٹریچر اور آرا کی نشر و اشاعت میں جی جان سے لگے ہوئے ہیں اسی انداز پر اسلامی علوم و فنون اور ORIENTAL زبانوں کو تحفظات عطا کی جائیں ۔
- عباسیوں کے 'بیت الحکمت' اور مغلوں کے 'دائرۃ المعارف' کے انداز پر علما و فضلا کی تنظیم قائم کی جائے جو مختلف عنوانات اور موضوعات پر تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگے رہیں لیکن اب چونکہ سلاطین اور والیان ریاست کی سرپرستی اور قدردانی مفقود یا محدود ہے قوم و ملت کو یہ احساس اور شعور دلایا جائے کہ وہ اس تنظیم کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں ۔ [23]

چونکہ مصنفین اور اہل قلم کا طائفہ عام طور پر ہر زمانے میں بے سروسامانی کا شکار رہا ہے اس لئے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ:

— ایسے صاحبان ذوق اگر تصنیفی کاموں میں منہمک ہوں گے تو ان کے بال بچوں کے معاش کا انتظام کیا ہوگا؟

— قدیم مصنفین کا کام کتابیں مکمل کر دینے کے بعد ختم ہوجاتا تھا۔ جن کو ضرورت ہوتی تھی اس کی نقلیں اور نسخے تیار کرا کے اپنے اپنے ملکوں تک پہونچا دیا کرتے تھے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے، اس لئے اب مصنفین کی کتابوں کی طبع واشاعت خود ایک مسئلہ ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے انتظام کون کرے گا؟ آج کے دور میں ایک بے سروسامان مصنف کے لئے یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنی ذہنی کاوش کو کس طرح بروئے کار لائے، کس ناشر کے ہاتھ اپنی کتاب کو فروخت کرے اور کس ناشر الطابع یا کس دارالاشاعت سے رشتہ جوڑے، طباعت کے مختلف مراحل سے گزرنے کے لئے کہاں سے وافر رقم لائے اور اگر کتاب چھپ جائے تو خریداروں کی تلاش کے لئے کون سا طریقہ اختیار کرے۔ یہ کام نہ ہر شخص کے بس کا ہے اور نہ ہر مصنف کو اس کا تجربہ اور سلیقہ حاصل ہوتا ہے۔ جب تک کوئی معقول ادارہ جس کے پاس ان مسائل کا حل موجود ہو اس معاملے کی ذمہ داری کو قبول نہ کرے مصنف کی محنت لاحاصل بن کر رہ جاتی ہے۔[۲۴]

مذکورہ بالا مشکلات اور مسائل کا حل مولانا شبلی نے دارالمصنفین کے قیام کی صورت میں نکالا جو ان کی زندگی میں تو ابتدائی صورت میں تھا لیکن ان کے لائق جانشینوں نے اس کو بار آور درخت کی شکل میں قائم کر دیا اور مصنفین اور اہل قلم کے لئے وہ تمام صورتیں اور سہولتیں فراہم کر دیں جو ان کو مطلوب ہوسکتی تھیں یا ہوسکتی ہیں۔

یہاں ہم دارالمصنفین کے ایک اور مقصد کی جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں اور شاید یہ اس کا سب سے اہم پہلو تھا وہ یہ کہ ترقی یافتہ ممالک نے جدید علوم کی تحقیق کے دوران علوم اسلامی کی تحقیق کے لئے بھی مخصوص شعبہ جات کو قائم کیا۔ اس طرح مستشرقین کا گروہ سامنے آیا جس نے عربی اور اسلامی علوم کی تحقیق پر خصوصی توجہ ڈالی اور اس ضمن میں اسلامی پہلوؤں پر قابل قدر تحقیقات کو پیش کیا جس کی جس قدر بھی تعریف وتوصیف کی جائے کم ہے لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ مستشرقین کے اس گروہ میں چونکہ ایسے اشخاص ہیں جو خود مسلمان نہیں ہیں اور اسلام کی بیش بہا دولت سے مالا مال نہیں ہیں انھیں اسلام اور اسلامی علوم سے وہ قدرتی اور فطری لگاؤ کبھی بھی نہ ہوا ہے اور نہ ہوسکے گا جو ایک مسلمان کو ہوتا ہے یا ہونا چاہئے۔ اس لئے ان کی تحریروں سے اسلام اور مسلمانوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر سخت نقصان اٹھانے پڑرہے ہیں۔ مستشرقین کے اس گروہ نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے جو سراسر مسیحیت اور مغربیت کی بنیادوں پر استوار تھا اسلام اور اسلامی علوم کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اسلام اور داعی اسلام پر اعتراضات کی

بھرمار کردی اور چھپے اور کھلے لفظوں میں غلط تعبیریں اور تشریحیں کیں۔ مسلمانوں میں مستشرقین کے اس سازشی اور تخارب گروہ کے خلاف جن لوگوں نے اپنے قلم کو وقف کردیا اور منہ توڑ جواب دیا اس میں مولانا شبلی اور ان کے رفقاء کو ہراول دستہ کی قیادت حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ اس حسن عمل کے لئے مولانا شبلی اور ان کے ادارہ دارالمصنفین کو اور اس ادارہ کے ترجمان معارف کے ذمہ داروں کو جزائے خیر عطا کرے اور اپنے کام کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ لگن، حوصلہ اور صلاحیت عطا فرمائے (آمین)

۲۔ تشکیل کا منصوبہ اور مقاصد مولانا شبلی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں دارالمصنفین کی تشکیل کا منصوبہ تیار کرلیا تھا۔ البتہ اس منصوبہ کو عملی شکل میں پیش کرنے کی سعادت ان کے لائق ترین شاگرد سید سلیمان ندوی اور ان کے نامور رفقاء کے حصہ میں آئی۔ مولانا شبلی نے دور جدید کے لحاظ سے یورپ کی علمی اکاڈمیوں کے طرز پر اور دور قدیم کے لحاظ سے عباسیوں کے بیت الحکمت کے طریقہ کار پر دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ بنایا تھا جس سے ملحق ایک شاندار کتب خانہ ہو جس میں ہر موضوع سے متعلق قدیم و جدید کتابوں کا وافر ذخیرہ ہو اور دنیا کی تمام نادر و نایاب کتابیں موجود ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ ان تمام کتابوں کے تراجم اردو زبان میں کردئے جائیں تاکہ نئے مصنفین کو ادھر ادھر بھٹکنے یا ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں مطلوبہ کتابوں کی تلاش میں سفر کرنے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ ان تمام زحمتوں اور صعوبتوں سے بچ جائیں جو خود مولانا شبلی کو بعض تصانیف کے لکھنے کے دوران اٹھانی پڑی تھیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مصنفین اگر عارضی یا مستقل طور پر قیام کرنا چاہیں تو ان کو ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں۔ اس کے علاوہ نئی کتابوں کو چھپوانے کے لئے جدید آلات سے لیس چھاپہ خانہ، دارالاشاعت اور دوسرے شعبے ہوں۔[۲۵]

مولانا کا خیال تھا کہ دارالمصنفین لکھنؤ یا علی گڑھ میں قائم کیا جائے۔ انھوں نے اپنے مخلص دوستوں مثلاً مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی وغیرہ سے مشورے کئے اور اپنے منصوبے کا اظہار اپنے حلقۂ احباب میں کرادیا۔

اگست ۱۹۱۴ میں ان کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحق کے انتقال کے بعد خانگی مسائل کو لیکر مولانا شبلی اپنے وطن اعظم گڑھ میں قیام کرنے پر مجبور ہوگئے اور یہ طے پایا کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں قائم کیا جائے۔ مولانا نے اپنی موروثی زمین کا ایک بڑا ٹکڑا جو تقریباً ۳ بیگہ کے باغات اور مکانات پر محیط تھا اور جس میں خاندان کے دوسرے شرکار کا بھی حصہ لگتا

تھا اس ادارہ کے لیے وقف کردیا اور رضاکارانہ طور پر یا معاوضہ دیگر دوسرے شرکاء سے بھی رہبری کرادی۔ نئے طلباء کی تربیت کے لیے دارالمصنفین میں عالم و فاضل کی تکمیل کے بعد ایک دو سالہ تربیتی کورس رکھا گیا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے ندوہ کے تکمیل شدہ یعنی ذہین اور کارگزار طلباء کا انتخاب بھی کرلیا اور اس ادارہ کے اخراجات کے لیے صورتیں پیدا کرلیں اور اس ادارہ کے قواعد اور ضابطوں کی تفصیلات بھی طے کردیں۔

چونکہ مولانا کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی اس لیے انھوں نے اپنے قابل اعتماد شاگرد اور رفیقوں کو اس منصوبے سے متعلق ضروری ہدایات اور وصیتیں فرمادی تھیں اور یہ بھی پیشین گوئی کردی تھی کہ " اور وہی شاید میرا مدفن بھی ہو"۔ [۲۶]

مولانا شبلی کی وفات کے تیسرے دن ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ کو ان کی وصیت کے مطابق ان کے نامکمل مشن کی تکمیل کے لیے ان کے احباب اور رفقاء سر جوڑ کر بیٹھے اور مولانا حمیدالدین فراہی کی دعوت پر ایک تنظیم 'اخوان الصفا' کے نام سے قائم ہوئی جس کے صدر مولانا حمیدالدین فراہی اور ناظم سید سلیمان ندوی مقرر ہوئے۔ اراکین میں مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی وغیرہ کو شمولیت حاصل ہوئی۔ اس مجلس نے سب سے پہلے سید سلیمان ندوی کو سیرت النبیؐ کی تکمیل کے ادھورے کام پر لگادیا۔ اس کے بعد بھوپال اور حیدرآباد کے والیان ریاست کی خدمت میں حاضر ہوکر مولانا شبلی کو ملنے والے وظائف کو دارالمصنفین کے حق میں منظور کرایا۔ مولانا مسعود علی ندوی نے دارالمصنفین میں مستقل اقامت اختیار کرکے دارالمصنفین کے پورے انتظام کو سنبھال لیا۔

[۲۱ تا ۲۶] ان تمام تفصیلات کے لیے سب سے بڑے اور مستند ماخذ
حیات شبلی — مولانا سید سلیمان ندوی کے صفحات ص ۶۹۰ تا ۶۹۹
اور حیات سلیمان — شاہ معین الدین احمد ندوی کے صفحات ص ۷۵ تا ۱۱۲
اور ابتدائی دور کے شذرات معارف ہیں۔

دارالمصنفین کے قیام کے بعد اس ادارے کے مندرجہ ذیل ۴ اہم مقاصد طے پائے:

۱۔ ملک میں اعلیٰ درجے کے مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔

۲۔ بلند پایہ اور معیاری کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ کے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کرنا اور ان کاموں میں مکمل ہمت افزائی کرنا۔

۳۔ دارالمصنفین کے اہل قلم حضرات کی تصانیف کو چھپوانے کا خصوصی انتظام کرنا، ساتھ ہی ساتھ دوسرے ضروری علمی وادبی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا۔

۴۔ جلد از جلد ایک علمی وادبی رسالے کے اجراء کے لئے راہوں کو استوار کرنا۔

دارالمصنفین میں تشنہ لبوں کے لئے سہولیات کا جائزہ حسب ذیل ہے:

۱۔ اس ادارہ میں ایک وسیع کتب خانہ، ایک پریس اور ایک دارالاشاعت ہے۔ کتب خانہ مختلف زبانوں کی تقریباً پندرہ ہزار منتخب کتابوں پر مشتمل ہے جس میں علمی نوادرات اور مخطوطات بھی شامل ہیں۔ کتب خانہ کے دارالمطالعہ کے کئی سیکشن ہیں جن میں ایک میگزین سیکشن بھی ہے جہاں کئی زبانوں میں چھپنے والے ملکی و غیر ملکی رسائل اور اخبارات پابندی کے ساتھ موصول ہوتے رہتے ہیں اور ان کے مطالعہ کے لئے ہر خاص و عام کو سہولیات حاصل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ علم کے پیاسوں کو حالات حاضرہ اور مسائل فی زمانہ سے واقف کرانے اور تفریح طبع کے مواقع میسر کرانے کا انتظام ہے۔ کتب خانہ کو زیادہ سے زیادہ جدید بنانے کی ضرورت ہے اور الیکٹرانک آلات اور کمپیوٹر سسٹم کو اختیار کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

۲۔ ادارہ تقریباً ۱۲ بیگھہ زمین کی اراضی پر مشتمل چہار دیواری سے گھرا ہوا ایک وسیع خوشنما باغات اور عمارات کے مجموعے کا نام ہے جہاں جا بجا گھنے درختوں کے سائے اور پارک بنے ہوئے ہیں۔ مسجد، قبرستان، مہمان خانہ، ملازمین اور مستقل رہائش کرنے والے مصنفین کی قیام گاہیں ہیں۔ شہر کے ہنگاموں سے دور ایک کنج سکون پر مشتمل یہ ادارہ قائم ہے جہاں تنہائی پسند طالبان علم اور اہل قلم حضرات کو ہر موسم کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ سکون اور یکسوئی سے کام کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر سنجیدہ اور شائستہ ماہرین فن اور بلند پایہ محققین کے قیمتی مشورے اور ضروری تعاون بھی حاصل رہتا ہے۔

۳۔ دارالمصنفین کی طرف سے ایک ماہانہ علمی وادبی رسالہ 'معارف' کے نام سے نکلتا ہے

جو اپنے بلند پایہ تحقیقی مضامین کے اعتبار سے برصغیر کے تمام رسالوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کے لکھنے والے خاص طور پر ملک کے مشاہیر اور نامور اہل قلم ہوتے ہیں ۔ 1916 سے آج تک یہ رسالہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے ۔ زمانہ کے نشیب و فراز اور وقت کے اتار چڑھاؤ اور مختلف مسائل اور دشواریوں کے حائل ہونے کے باوجود آج تک اس رسالہ کی اشاعت میں رکاوٹ نہیں پیدا ہو سکی اور نہ ہی معیاری صحافت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پایا ۔ علم و ادب کے کہنہ مشق قلم کاروں اور نئے تربیت یافتہ اہل قلم اشخاص دونوں ہی کو قلم فرسائی کے مواقع عطا کرتا ہے ۔

۳۔ اراکین مجلس انتظامیہ

25 مئی 1915 کو دارالمصنفین کے خصوصی اجلاس میں باہمی مشورہ اور اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل مقتدر اشخاص کو رکن اساسی کی حیثیت سے مقرر کرنے کی تجویز پاس ہوئی :

ارکان خصوصی

۱۔ مولانا حمید الدین فراہی — صدر
۲۔ سید سلیمان ندوی — ناظم
۳۔ مولانا مسعود علی — منیجر
۴۔ حامد نعمانی خلف شبلی نعمانی
۵۔ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی علی گڑھ
۶۔ نواب سید علی حسن خان لکھنؤ
۷۔ سر عبد القادر پونہ
۸۔ ڈاکٹر اقبال لاہور
۹۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی
۱۰۔ مولانا عبد اللہ عمادی
۱۱۔ مولانا عبد الماجد دریابادی

دارالمصنفین کا انتظام چلانے کے لئے دو مجلسیں مقرر ہیں ۱۔ مجلس عاملہ ۲۔ مجلس انتظامیہ

ـــ مجلس عاملہ ۷ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے ۔ ابتداء میں اس مجلس کی صدارت مولانا حمید الدین فراہی کے سپرد ہوئی ۔ ان کے بعد علی الترتیب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی

ڈاکٹر سید محمود، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو تفویض ہوئی۔

مجلس انتظامیہ ۱۵ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جس میں ملک کے چیدہ چیدہ علماء و فضلاء اور صاحبان کمال شامل ہوتے ہیں۔ انھیں ارکان میں سے کچھ لوگوں کو مجلس عاملہ کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ ابتداء میں مجلس انتظامیہ کی صدارت نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کے سپرد ہوئی تھی اور شمس کرامت حسین نائب صدر بنائے گئے تھے۔ اب اس کے موجودہ صدر حیدرآباد کے نظام ثانی کے برادر خورد نواب میر مفخم جاہ بہادر ہیں

۴۔ شعبہ جات دارالمصنفین کے زیرِ انتظام مندرجہ ذیل شعبے کام کرتے ہیں :

۱۔ دارالکتب

۲۔ دارالتصنیف

۳۔ دارالاشاعت

۴۔ دارالطباعت

۵۔ شعبہ معارف

۶۔ شعبہ تعمیرات

ا۔ دارالکتب ابتداء میں یہ کتب خانہ مولانا شبلی کی باقی ماندہ کتابوں سے جو ندوہ کو دینے کے بعد بچ گئی تھیں اور ان کے اعزا واقارب کی طرف سے دی گئی کتابوں کے ذریعے تشکیل پایا لیکن دھیرے دھیرے جوں جوں رقوم کی فراہمی ہوتی رہی اور ذرائع و وسائل دستیاب ہوتے رہے کتب خانہ کا پھیلاؤ بڑھتا گیا اور تازہ مطبوعات اور نئی کتابوں کے اضافے ہوتے رہے۔ اس وقت یہ کتب خانہ مشرقی اور مغربی علوم کی کتابوں کا سنگم سمجھا جاتا ہے۔ پھر بھی کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے جس سے جدید ترین کتابوں کی خریداری کا کام جاری رکھا جائے۔ کتب خانہ کے لئے جدید سہولتوں و آسائشوں اور زمانہ کے مطابق بنیادی ضرورتوں سے آراستہ علیحدہ عمارت کی بھی اشد ضرورت ہے۔

کتب خانہ میں نوادرات اور قلمی کتابوں کا جائزہ اس طرح ہے :

گرامر سے متعلق	کتاب الجمل	عربی نحو پر ابوالقاسم زجاجی کی تصنیف ہے
	فرہنگ جہانگیری	فارسی لغت میں جمال الدین حسینی انجو کی تصنیف ہے
	موید الفضلاء	فارسی لغت میں محمد بن لاد دہلوی کی تصنیف ہے ۔
مواعظ حسنہ سے متعلق	شرح نہج البلاغہ	نہج البلاغہ حضرت علی رض کے خطبات کا مجموعہ ہے ۔ اس کے مرتب سید رضی الدین محمد ہیں ۔ اس کتاب کے شارح عز الدین عبدالحمید متوفی ٦۵۵ ھ ہیں ۔
مذہبی مسائل سے متعلق	کتاب المیزان	امام عبدالوہاب بن احمد بن علی شعرانی متوفی ٩٧٣ ھ کی تصنیف ہے
	الیواقیت والجواہر	یہ بھی امام عبدالوہاب بن احمد بن علی شعرانی ہی کی تصنیف ہے
سیر و تواریخ سے متعلق	عمدۃ النسب فی نسب ابی طالب	جمال الدین احمد المعروف ابن عقبہ متوفی ٨٢٨ ھ کی تصنیف
	وفیات الاعیان	احمد بن ابراہیم بن ابی بکر بن خلکان متوفی ٦٨١ ھ کی تصنیف
	مطالع الانوار	عفیف نور کاشانی کی تصنیف ہے ۔
	المغنی فی اسماء الرجال	علامہ محمد بن طاہر پٹنی متوفی ٩٨٦ ھ کی تصنیف ہے
	اکبر نامہ	فارسی میں ابوالفضل علامی کی مشہور تصنیف ہے جو مصور ہے
	روضۂ تاج محل	فارسی میں ملکہ ممتاز محل کی لکھنؤ اور تاج محل پر مصور کتاب ہے
	خلاصۃ التواریخ	فارسی میں سجان رائے کھتری کی تصنیف ہے ۔
	ظفر نامہ امیر تیمور	فارسی میں شرف الدین علی یزدی کی تصنیف ہے
	تاریخ فرشتہ	فارسی میں عہد وسطی کی تاریخ پر مشہور کتاب ہے ۔
	قصص العجائب	فارسی میں داراشکوہ کے ایما پر مفتی عبدالواحد بن محمد کی تصنیف ہے
	تزک جہانگیری	فارسی میں محمد ہادی کا مرتب کیا ہوا قلمی نسخہ ہے ۔
	روضۃ الصفا	فارسی میں محمد بن خاوند شاہ متوفی ٩٠٣ ھ کی تصنیف ہے
	سکندر نامہ	فارسی میں نظامی گنجوی کی تصنیف ہے ۔
فلسفہ سے متعلق	رسائل اخوان الصفا	چوتھی صدی کے کچھ اہل علم نے اخوان الصفا کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی ۔ یہ لوگ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتے تھے ۔
	دانش نامہ جہان	فارسی میں حکیم غیاث الدین علی بن علی حسینی متوفی ٧٠٦ ھ کی تصنیف ہے

اوراد وظائف سے متعلق   دلائل الخیرات   ابو عبداللہ محمد بن سلیمان ہمدانی حسنی کی مشہور و معروف تصنیف ہے، مصور ہے

جواہر خمسہ   فارسی میں دعا و اذکار کے موضوع پر مولانا محمد المخاطب بہ غوث کی تصنیف ہے

تفسیر سے متعلق   تفسیر بیضاوی   قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی کی تفسیر ہے۔

جامع الرموز   وقایہ کی شرح ہے۔ شارح کا نام شمس الدین قہستانی اور کاتب حامد بن شیخ زکریا ہیں

حاشیہ شرح حکمۃ العین   ملا نجم الدین ابو الحسن قزوینی کی تصنیف حکمۃ العین کی شرح ہے شارح شمس الدین ہیں

التفسیر الاحمدیہ   ملا جیون امیٹھوی استاد اورنگ زیب عالمگیر کی مشہور تصنیف ہے۔

انوار التنزیل   حسین بن محمد نیشاپوری کی تفسیر ہے۔

تفسیر مواہب   فارسی میں ملا حسین واعظ کاشفی متوفی ۹۱۰ ھ کی تفسیر ہے۔

حدیث سے متعلق   الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ   قاضی عیاض مالکی متوفی ۵۴۴ ھ کی تصنیف ہے۔

مدارج النبوۃ   فارسی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بلند پایہ تصنیف ہے۔

منطق سے متعلق   لوامع الاسرار فی مطالع الانوار   قاضی سراج الدین محمود بن ابی بکر متوفی ۶۸۲ ھ کی تصنیف ہے۔

فقہ سے متعلق   شرح منار الانوار

تصوف سے متعلق   احیاء العلوم   امام غزالی کی مشہور تصنیف ہے۔

نفحات الانس   فارسی میں مولانا جامی کی مشہور تصنیف ہے۔

مرقعۃ السلوک   فارسی میں شیخ محمد چشتی معاصر اورنگ زیب عالمگیر کی تصنیف ہے۔

انیس الارواح   فارسی میں خواجہ عثمان ہارونی کے ملفوظات پر مشتمل خواجہ غریب نواز کا مرتبہ

کلمۃ الحقائق   فارسی میں شاہ برہان العارفین کی تصنیف ہے۔

طب و جراحت سے متعلق   عمدۃ الجراحین   ابو الفرج بن موفق الدین متوفی ۶۸۵ ھ کی تصنیف ہے۔

شاعری سے متعلق   کلیات کلیم   فارسی میں شاہ جہاں کے درباری شاعر کلیم کی کلیات ہے۔

مثنوی فتوح الحرمین   فارسی میں مولانا جامی کی تصنیف ہے۔

دیوان شاہ قاسم انوار

مرثیہ کربلا   دکنی زبان میں

گلستاں + دیوان حافظ + مثنوی ناصر علی سرہندی

تذکرہ مخزن الغرائب   احمد علی ہاشمی سندیلوی کا مشہور تذکرہ شعراء بہ زبان فارسی

فتاویٰ سے متعلق   فتاویٰ بابری   فارسی میں نور الدین قطب الدین کی تصنیف۔

ہندو دھرم سے متعلق   ستر اکبر   ہندو ویدانت کی مشہور کتاب اپنشد کا فارسی ترجمہ   مترجم دارا شکوہ

ترجمہ مہابھارت   مہابھارت کا فارسی ترجمہ

متفرق موضوعات پر   شرح اشارات   فارسی میں ابو عبداللہ محمد نصیر الدین محقق طوسی کی تصنیف

مخلخہ وراحت الصدور   فارسی میں فن عطر سازی پر حسین مرزا اور محبوب علی خان بہادر کے رسائل۔

بدایع العجائب   فارسی میں امیر خسرو کی تصنیف

مراۃ العالم   فارسی میں بختاور خان کی تصنیف

بدایع الانشاد   فارسی میں انشاد و بلاغت پر یوسف بن محمد ہروی کی تصنیف

نسخہ اختر ہزاری   فارسی میں علم نجوم پر شیر با محمد ہزاروی کی تصنیف۔

۲۔ دارالتصنیف

یہ شعبہ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔

i ۔ دارالمصنفین کے انتظام کے تحت کام کرنے والے رفقاد اور مصنفین پر مشتمل

ii ۔ دارالمصنفین سے باہر کے مصنفین اور مترجمین سے متعلق۔

اول الذکر حصہ سے شروع شروع میں صرف دو آدمی وابستہ ہوئے۔ ایک سید سلیمان ندوی اور دوسرے مولانا عبدالسلام ندوی۔ بعد میں مشاہیر اہل قلم رفقاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے عربی اور انگریزی دونوں علوم کے ماہرین کی اس میں شمولیت رہی۔ موخر الذکر حصہ کا تعلق ان مصنفین و مترجمین سے ہے جن کا تعلق دارالمصنفین کے انتظامیہ سے باہر ہے اور جن کی کتابیں معاوضہ کے ساتھ یا بلا معاوضہ شائع ہوتی ہیں۔ دارالتصنیف کی مندرجہ ذیل خوبیاں ہیں:

i ۔ تصنیف و تالیف کا معیار بلند کیا اور بلند پایہ نمونے پیش کرکے ملک کا مذاق بدل دیا جس نے ہر خاص و عام کو بے حد متاثر کیا۔

ii ۔ مختلف موضوعات علمی وادبی سے متعلق استفسارات کے جواب نہایت محققانہ اور تشفی بخش انداز میں دیتا ہے جس میں دارالمصنفین کے رفقاد کا بہت کافی وقت صرف ہوتا ہے۔

۳۔ دارالاشاعت

دارالمصنفین کا یہ شعبہ اب تک دو سو سے زائد کتابیں شائع کرچکا ہے جن میں سے بیشتر کتابیں انتہائی نادر و نایاب اور غیر معمولی شہرت کی مالک ہیں

اور اہل علم کے حلقوں میں انھیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سیرت النبی کا تو جواب ہی نہیں۔ دارالمصنفین کی اکثر کتابوں پر مختلف ذمہ دار اداروں اور اکیڈمیوں کی طرف سے انعامات مل چکے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتابیں ہندو پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں اور درس گاہوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہیں:

شعرالعجم + موازنہ انیس و دبیر + شعرالہند + گل رعنا + اقبال کامل + انقلاب الامم + ابن خلدون + تاریخ اسلام + ہماری بادشاہی + مختصر تاریخ ہند + رحمت عالم + دروس الادب۔

۴۔ دارالطباعت جون 1916 میں معارف پریس کے نام سے یہ شعبہ قائم ہوا شروع میں لیتھو پرنٹنگ کی صرف ایک مشین تھی۔ بعد میں دو مشینوں کا اضافہ ہوا۔ دونوں مشینیں ہاتھ کی بجائے بجلی سے چل رہی ہیں اور چھپائی پتھر کی بجائے پلیٹ پیپر پر ہو رہی ہے۔ کئی برسوں سے ونڈانگ سسٹم پر چھپائی کا کام ہو رہا ہے اور کتابت بھی پرانے انداز کی بجائے کمپیوٹر کی مدد سے کی جا رہی ہے۔

۵۔ شعبۂ معارف یہ ایک اہم شعبہ ہے جو جولائی 1916 سے آج تک پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے اور ملک کے اندر اور باہر سنجیدہ اور مستند اہل قلم کی توجہات کا خصوصی مرکز بنا ہوا ہے۔ اردو کا یہ سب سے قدیم معیاری رسالہ ہے جس کے مضامین دوسرے رسالوں میں نقل کئے جاتے ہیں اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ دارالمصنفین کا خصوصی نقیب اور ترجمان ہے۔ یہ اپنے رنگ اور انداز کا منفرد رسالہ ہے۔ اس رسالے کی ادارت کے فرائض مندرجہ ذیل حضرات نے یکے بعد دیگرے انجام دیئے۔

مدیر اول	سید سلیمان ندوی
مدیر دوم	شاہ معین الدین احمد ندوی
مدیر سوم	سید صباح الدین عبدالرحمن
مدیر حال	مولانا ضیاء الدین اصلاحی

۶۔ شعبۂ تعمیرات شروع میں مولانا شبلی نے اپنی اور اپنے اعزا و اقارب کی جو

زمینیں دارالمصنفین کے حق میں وقف کرائی تھیں ان پر دو بنگلے بنے ہوئے تھے ۔ اس کے بعد دارالمصنفین کے مہتمم مولانا مسعود علی ندوی نے اپنی کارگزاری اور جانفشانی سے کتب خانہ، پریس، دفتر، رہائشی مکانات اور کمرے تعمیر کرائے ۔ کتب خانہ میں ہر رفیق کا علیحدہ کمرہ ہے جہاں سکون اور یکسوئی کے ساتھ وہ تحقیقی کاموں کو انجام دے سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور علی گڑھ کے عطیہ خاص سے ایک خوبصورت مسجد بھی مولانا مسعود علی ندوی کی ایک اہم یادگار ہے ۔ نئی تعمیرات کے منصوبے زیر غور ہیں جن میں جدید طرز کے کتب خانہ کی تعمیر کا منصوبہ ہے لیکن ابھی تک نہ اس کے لئے انتظامات ہو سکے ہیں اور نہ عمل درآمد ہو سکا ہے ۔

(۴) دارالمصنفین کے امتیازات و خصائص

۱۔ مخصوصات اس قابل قدر ادارہ کی علمی روایات میں سے ایک روایت یہ ہے کہ اس ادارے کے مصنفین اور اہل قلم عام اخباروں اور رسالوں میں چھپنے سے بہت گریز کرتے ہیں بقول سید صباح الدین عبدالرحمن "اگر ہم صرف چھپنے میں لگ جائیں تو شبلی و سلیمان کے مشن کی تکمیل نہ کر سکیں گے ۔ ہم کو دھن ہے تو صرف یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے جس کام کا سلسلہ جاری کیا تھا اس کو کسی طرح مکمل کر دیں ۔ اس ادارہ کے علمی خدمت گزاروں نے اپنی تمام عمریں یہاں گزار دی ہیں لیکن ان کے نام ایک محدود حلقہ سے زیادہ پھیلے ہوئے نہیں ۔ اور کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا تو ان کو شکایت بھی نہیں ہوتی کیونکہ نشرواشاعت ان کا مسلک بھی نہیں ۔ وہ تو 'گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے' کے قائل ہیں اور وہ اپنے گوشۂ عافیت میں تمام ہنگاموں سے دور اور نمود و نمائش سے بے نیاز ہو کر شبلی و سلیمان کے بنائے ہوئے نصب العین کی طرف تکمیل ہی کی فکر میں سرگرداں رہنا چاہتے ہیں ۔ 'نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا' ہی سے کوئی کام انجام پا سکتا ہے اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔" [۲۷]

پورے ملک میں دارالمصنفین اس اعتبار سے منفرد ادارہ ہے کہ اس کا اپنا وسیع کتب خانہ ہے، اپنا برقی پریس ہے، اپنا گیسٹ ہاؤس ہے، ۲۴ گھنٹے شامل حال رہنے والے اپنے رفقاء و مصنفین ہیں جن میں سے اکثر کی رہائش گاہیں دارالمصنفین کے وسیع و عریض اور پُرسکون و پُربہار احاطے میں واقع ہیں

اور جو دنیاوی مشاغل اور ہنگاموں سے الگ رہ کر ایثار وخلوص اور سادگی و قناعت کے ساتھ علم وفن کی خدمت میں یکسوئی کے ساتھ منہمک رہتے ہیں ۔ یہاں فارغ التحصیل طلباء کو تحقیق و تلاش ، تصنیف وتالیف ، غور و مطالعہ اور توسیع معلومات کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور ان کی ذہنی تربیت اور تحریری مشق کے سروسامان بہم پہونچائے جاتے ہیں ۔ [۲۸]

دارالمصنفین شروع ہی سے حکومت کی سرپرستی اور قوم کی امداد و تعاون کے بغیر علم وفن کی خدمت انجام دیتا رہا ہے ۔ نہ انگریزوں کے دور میں ان کی حکومت کی جانب سے امداد کی پیش کش قبول کی اور نہ موجودہ قومی حکومت نے جب اس کی طرف فیاضی کا ہاتھ بڑھایا تو اسے قبول کیا ۔ اس کے کارکن محض بقدر کفاف پر راضی و قانع رہ کر علم کی خدمت میں مصروف رہے ۔ آزادی سے پہلے حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں سے کسی قدر مالی امداد ہوجاتی تھی مگر اب اس کی آمدنی کا اصل ذریعہ اس کی کتابوں کی تجارت پر رہ گیا ہے جس میں بڑی بندشیں اور دشواریاں حائل ہیں ۔ ان حالات میں اس کے کارکنوں کے بقدر کفاف گزارہ کا سامان بھی نہیں ہورہا ہے ۔ [۲۹] ایسے سنگین حالات میں بھی اس قابل قدر ادارہ کے وابستگان استقامت اور خوش دلی کے ساتھ کام کررہے ہیں ۔ وہ اپنی سادگی اور بے سروسامانی پر مطمئن نظر آتے ہیں ۔ نہ تو اپنا منہ میلا کرتے ہیں ، نہ حرف شکایت زبان پر لاتے ہیں اور نہ بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں ۔ یہ صبر وشکر اور توکل واستغنا کی دولت انھیں اپنے بزرگوں سے وراثتاً ملی ہے اور وہ اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ ہر زمانے میں ان کی قابل قدر خدمات کے صلے میں متبادل مناصب کی پیش کش کی جاتی رہی مگر دنیاوی منافع اور بڑی رقوم کی خاطر سفر کی صعوبتیں جھیلنے کی بہ نسبت انھوں نے دارالمصنفین کی چہار دیواری کی قید و بند ہی کو ترجیح دی اور کئی نسلوں سے اب یہ ان کا مزاج اور فطرت ثانیہ بن چکی ہے ۔ مادیت کی اس ہما ہمی کے دور میں جبکہ ہر شخص پیسے اور صرف پیسے کو پہچانتا ہے ذہین اور کارگزار لوگوں میں ایسے متوکل اور مستقیم الاحوال لوگ مشکل سے دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے ہی ایثار پسند لوگوں سے مدارس ، خانقاہیں اور تعلیمی ادارے قائم ہیں ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کو جس زمانے میں حیدرآباد اسٹیٹ کے محکمہ تعلیمات کی طرف سے پانچ سو روپئے ماہانہ کی پیش کش ہوئی تھی تو انھوں نے اس وقت یہ عذر کرکے اس پیش کش کو مسترد کردیا تھا کہ دارالعلوم سے مجھے پانچ روپئے

ماہانہ ملتے ہیں جن میں سے تین روپئے میرے خانگی ضروریات میں خرچ ہوجاتے ہیں اور دو روپئے پس انداز رہتے ہیں جن کو خرچ کرنے کے لئے سوچنا پڑتا ہے تو پھر ان ڈھیر سارے روپیوں کا میں کیا کروں گا۔[۳۰] یہ سب واقعات پڑھ کر بڑی عبرت ہوتی ہے کہ کیسی خیر و برکت سادگی اور قناعت پسندی کا زمانہ تھا جبکہ آج حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ دارالمصنفین کے ذمہ دار حضرات بھی بتاتے ہیں کہ سید سلیمان ندوی سے لیکر سید صباح الدین تک نہایت قلیل اور برائے نام تنخواہوں پر دارالمصنفین کے کارگزار کام کرتے تھے۔ مولانا محمد عمر الصدیق دریابادی صاحب انکشاف کرتے ہیں کہ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے انتقال کے بعد ان کی ایک ذاتی نوٹ بک ہاتھ لگی جس میں ایک پیسے کے خانگی اخراجات کا پورا محض چند سو روپیوں پر مشتمل تھا جو اس قدر ناکافی تھا کہ ہر ماہ بنیے کا قرض بدستور قائم رہتا[۳۱] دارالمصنفین کی اس وقت چوتھی نسل جاری ہے اور ابھی تک بزرگان سلف کا صبر و توکل اور قناعت پسندی برقرار ہے، آئندہ بھی روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ تقریباً ایک صدی تک اپنے نامور اسلاف کے ورثہ کی حفاظت سعادت مندی اور نیک نامی کے ساتھ کرلینا تعجب اور قدر دانی کی بات ہے جو فی زمانہ مفقود ہے۔

۲- قدرداں

دارالمصنفین کے قدر دانوں کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے۔ اس میں سابقہ والیان ریاست کے نام آتے ہیں، ہندوستان پاکستان کے سربراہان حکومت اور اہم سیاسی عہدیداروں کے نام آتے ہیں، اندرون و بیرون ملک کے دانشوروں کے نام آتے ہیں وغیرہ سابقہ بھوپال اور حیدرآباد ریاستوں کے والیان نے خصوصی طور پر اس ادارہ پر نظر عنایت فرمائی اور بے گراں قدر عطیات سے وقتاً فوقتاً نوازتے رہے اور خبرگیری اور دلجوئی فرماتے رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، فخرالدین علی احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی، اکبر علی خان وغیرہ کے ذاتی مراسم اس ادارہ کے ذمہ داروں سے رہے۔ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، سر تیج بہادر سپرو، جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا، ونوبا بھاوے، لال بہادر شاستری وغیرہ کے بھی قریبی روابط اس ادارہ سے رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو متعدد بار دارالمصنفین تشریف لائے۔ وہ سید سلیمان ندوی

کے روبرو اس طرح مودب بیٹھے تھے جس طرح ایک بچہ اپنے استاد کے روبرو زانوئے ادب تہہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر انصاری، علی برادران، خواجہ عبدالمجید، تصدق احمد شیروانی، چودھری خلیق الزماں، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حسرت موہانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ اور فراق گورکھپوری، پیارے لال، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، رام بابو سکسینہ، اشوک مہتہ وغیرہ کو بھی اس ادارہ سے تعلق رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو، مولانا کوثر نیازی، جنرل ضیاء الحق وغیرہ بھی دارالمصنفین کے معاملات میں وقتاً فوقتاً لطف و کرم کی نظر فرماتے رہے۔ پاکستان کے ارباب سیاست اور صاحبان اقتدار کے روابط مختلف ادوار میں اس ادارے کے ساتھ قائم رہے۔

ش ۲۷ مولانا شبلی کیا تھے — سید صباح الدین عبدالرحمٰن
ماخوذ از رسالہ البصیر شبلی نمبر ص ۱۰۰

ش ۲۸ + ش ۲۹ } ماخوذ از کتابچہ تعارف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی ص ۴۹ + ۵۰

ش ۳۰ عہد رفتہ — ڈاکٹر طٰہٰ حسین ص ۱۰۷

ش ۳۱ مولانا عمیر الصدیق دریابادی سے ایک ذاتی ملاقات

۵ معارف کا اجراء 81

۱۔ تعارف — اگر یہ کہا جائے کہ دارالمصنفین اور معارف دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے، ساتھ ہی ساتھ ایک کے وجود کو سمجھنے کے لئے دوسرے کے وجود کا علم و عرفان ہونا ناگزیر ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ دارالمصنفین کی عظیم خدمات جو کچھ بھی رہی ہیں معارف کے شفاف کوب شیشے پر آئی خوبصورتی سے اور ایسے مربوط تسلسل کے ساتھ منعکس ہوتی رہی ہیں جس کے حسن دید اور حسن ذوق کی لذت کو اہل نظر ہی بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ 1915 کے پرفتن دور میں غیر منقسم ہندوستان کے سب سے زیادہ مردم خیز صوبے اتر پردیش کے علم دوست شہر اعظم گڑھ میں جس وقت اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا ایک صاف ستھرے غیر جانب دار معیاری علمی و ادبی مجلے کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو نہ صرف یہ کہ اس فعال اور متحرک ادارہ کے ترجمان کی خدمات انجام دے سکے بلکہ حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر بیدار اور ہم آہنگ ہو، ہر ضابطہ و اصول کا پابند ہر ادب و لحاظ کو ملحوظ رکھنے والا ہو، مختلف انداز کے علمی و ادبی حلقوں میں ربط و تسلسل کا کام کر سکے اور علم و ادب کے ہر شیدائی کی پیاس کو خاطر خواہ طور پر بجھا سکے۔ خود مولانا شبلی نے دارالمصنفین کی تشکیل کا خاکہ مرتب کرتے وقت اس بات کو اولین اہمیت دی تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ایک مستند اور موثر علمی و ادبی مجلے کی اشاعت کے لئے راہوں کو استوار کیا جائے۔ اس رسالے کا نام 'معارف' بھی خود علامہ ہی تجویز فرما چکے تھے اور اس کے مخصوص خدوخال کی بابت خود ہی ہدایات دے چکے تھے۔ لیکن چونکہ ابتداء میں دارالمصنفین کا اپنا پریس قائم نہیں ہوا تھا اس لئے مذکورہ رسالہ کی اشاعت فوری طور پر عمل میں نہ آسکی۔ دارالمصنفین کے منتظمین اور مخلصین ابتداء میں اس ادارہ کے قیام و تاسیس کے مسائل میں اس طرح الجھے رہے کہ اس کام کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ جب بعض کچھ اطمینان اور فراغت نصیب ہوئی تو دیگر فرائض کی انجام دہی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ برس کی تاخیر ہوئی۔ وسط 1916 میں معارف کا پہلا شمارہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں جو دارالمصنفین کے ناظم اعلیٰ بھی تھے منظر عام پر آیا اور ارباب حل وعقد سے خراج تحسین حاصل کرنے میں نہ صرف یہ کہ سو فی صد کامیاب ہوا بلکہ اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے ایسی مستحکم اور غیر متزلزل بنیاد قائم کردی جس پر علم و ادب کا

ہر کارواں بلا خوف و خطر چلتا رہا اور اپنی منزل پر پہونچتا رہا ۔

معارف کے اجراء کا زمانہ برصغیر کی تاریخ کا وہ پُر آشوب ہنگامی دور تھا جب پہلی جنگ عظیم کے مہیب شعلے نہ صرف یہ کہ بڑی تیزی سے جغرافیائی حدود کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے بلکہ علم و ادب اور افکار و خیالات کی دنیا کو بھی پورے طور پر اپنی زد میں لے چکے تھے ۔ پرانی قدریں پامال ہورہی تھیں اور نئے اوزان و اقدار مرتب کئے جارہے تھے ۔ ایک طبقہ سراسیمہ اور سہما ہوا سا نظر آتا تھا، دوسرے طبقے کے حوصلوں کو روز بروز وسعت و جلا نصیب ہورہی تھی ۔ ارباب حل و عقد دو محاذ پر بٹے ہوئے تھے ۔ ایک تو قدیم روایت پسند قدامت پسند طبقہ ہے اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور سرپرستی کے لئے اور نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے لئے جدید وسائل اور تحقیق و تنقید اور اسلوب تحریر کی نئی تکنیک سے آشنائی کی فوری ضرورت محسوس کی جارہی تھی اور دوسرا جدید روشن خیال، جدت پسند حوصلہ مند طبقہ جو اپنی تحقیق و تزئین اور ایجاد پسندی کی سبک رفتار گاڑی کو اس طور پر ہانکنے میں مصروف تھا کہ دائیں بائیں اور پیچھے مڑ کر بھی دیکھنے کو تیار نہ تھا بلکہ اُن پُرعظمت واقعات اور پُر معنی احساسات سے قطعی لاعلم اور بے خبر تھا جنھوں نے ان کے نامور اسلاف کی شہرت میں چار چاند لگائے تھے اور انھیں اوج ثریا پر پہونچنے کا حوصلہ عطا کیا تھا ۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ دونوں مکاتیب فکر اور اسلوب تحریر میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کی جائے، محارب قوتوں کو ایک دوسرے کے حق میں نافع اور موثر بنایا جائے، تادیب و تخریب کی باوقار ادائیں وضع کی جائیں، دونوں انداز کی طرز ادا کی خامیوں کو درست کرکے علم و ادب کی بساط پر مشاطہ گری کی اُس فنکارانہ مثال کو پیش کیا جائے جو اپنے تو اپنے غیروں کا بھی دل جیت لے ۔ اس وسیع و عریض ہندوستان کو جس کی جغرافیائی حدود اُس دور میں شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے لیکر مغرب تک بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں ایک متوازن طرز ادا والے ایک ایسے معیاری اُردو رسالے کی شدت سے ضرورت محسوس ہورہی تھی جو وقت کی اہم ترین ضرورتوں کو پورا کرسکے ۔ معارف نے ایسے ہی وقت میں علمی و ادبی بساط پر صور اسرافیل پھونک دیا، بے شمار علمی موضوعات کے لئے نت نئے مخارج اور سرچشمے پیدا کئے، اسلامی اور ادبی علوم کے دفاتر میں مضامین کے ذخائر کا وسیع انبار اکٹھا کردیا اور علمی و تحقیقی مضامین لکھنے والے اور پڑھنے والے سیکڑوں مشاہیر سے دنیائے علم و ادب کو روشناس کرادیا ۔

۲- ابتدائی خاکہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے جولائی 1916 مطابق رمضان المبارک 1334ھ میں معارف کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ یہ پرچہ اپنے متعلقہ ادارے کا ORGAN تھا۔ مولانا شبلی کی ایک قلمی یادداشت جو دارالمصنفین کی آرکائوز میں محفوظ ہے اس کے مطابق معارف کے مجوزہ خدوخال کو اس طور پر نمایاں کیا گیا ہے:

رسالہ کا نام — معارف

چیف ایڈیٹر کا نام — مولانا شبلی

اسٹاف کے اراکین — مولوی سلیمان + مولوی عبدالماجد + منشی حفیظ + مولوی عبدالسلام

تقطیع و کاغذ — 29 × 20

صفحات — 40

قیمت — 3/-

تنوعات مضامین — فلسفہ + تاریخ قدیم و جدید + سائنس

ادبیات — شعر + اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب متنوعہ

اقتباسات — مجلات علمیہ یورپ مصر بیروت

فن تعلیم — کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات پر اظہار رائے

تنقید — کتب یا علوم قدیمہ پر

مصر سے المقتطف + الہلال + المنار اور بیروت سے المقتبس قیمتاً منگوائے جائیں، یورپ کے علمی پرچے منگوائے جائیں۔

معارف کا سائز ہمیشہ ابتدا سے آج تک $\frac{20 \times 26}{8}$ ہے۔ شروع کے تین سالوں اور زمانہ جنگ میں اس کی ضخامت 60 صفحے تھی۔ اس کے بعد جولائی 1919 سے تادم تحریر اکثر و بیشتر 80 صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔ کاغذ کی گرانی اور معارف طبع میں اضافہ کے مطابق اس کی سالانہ قیمت برابر ہوتی رہی۔ 1916 میں سالانہ زر تعاون 4 روپے تھے۔ جبکہ 1999 میں 80 روپے ہے۔ گویا 20 گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود ہر عہد میں یہ اردو کا سب سے سستا رسالہ رہا ہے۔ اس کی قیمت اصل لاگت سے بھی کم رکھی جاتی تھی تاکہ اس کی افادیت بیش از بیش عام ہو سکے۔ خالص علمی رسالہ

ہونے کے باعث اس کے خریداروں کا حلقہ بہت محدود رہا لیکن اپنے محدود حلقے میں یہ رسالہ بے حد مقبول رہا ہے۔ باوجودیکہ اس کے خریدار کم رہے ہیں، اس کے پڑھنے والوں کا دائرہ خاصا وسیع رہا ہے۔

۳۔ ابتدائی دشواریاں سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں " معارف نے 1916 کے اختتام پر اپنی عمر کی پہلی ششماہی پوری کی۔ یہ رسالہ ایسے وقت میں نکلا جب تمام عالم حیات و ممات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہندوستان گو مرکز جنگ سے بہت دور ہے لیکن حاکمیت اور محکومیت کے فطری تعلق کی بنا پر اس کو بھی میدان جنگ کے اندر ہی سمجھئے۔ قانون کی سخت گیری ایک طرف اور سامان طبع کی کمیابی نے دوسری طرف ہندوستانی پریس کے پرانے اور کہنہ سال دفتروں کو ماتم کدہ بنادیا ہے، پھر اطفال نوخیز کی داستان غم کیا سنائی جائے جن کی زبان حال پر یہ مصرع ہے :

ع اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

معارف میں جو کاغذ لگتا ہے تمام ہندوستان میں آج کل کسی اردو رسالہ میں نہیں لگتا، بایں ہمہ یہ حرف لطیف خاطر گوارا ہے کہ احباب کی تواضع و مدارات میں فرق نہ آئے لیکن آخر معارف کے قدر دانوں پر بھی تو کچھ فرائض عائد ہیں۔ یہ فقرہ اس لئے زبان قلم پر آگیا کہ " کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے "۔ [۳۲]

معارف کو خوب سے خوب تر بنانے اور عصری صحافت میں اس کو صف اول میں جگہ دلانے کے لئے سید صاحب نے اپنی تمام علمی و صحافتی صلاحیتوں کو صرف کردیا تھا۔ جب 1916 میں اس کا اجراء ہوا اس وقت سے کئی سال تک مسلسل اس رسالہ کا تمام بار تن تنہا اپنے دوش ناتواں پر اٹھائے رہے۔ ہر نمبر کے لئے دو ایک مستقل مقالے لکھنا، کئی کئی صفحات کے شذرات تیار کرنا جن میں مختلف موضوعات پر گوناگوں تبصرہ ہو اور متعدد کتابوں پر ریویو کرنا یہ سب سید صاحب کے ذمہ تھا۔ ان ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ مستقل تصنیف و تالیف و جابجا لکچر، کانفرنسوں اور انجمنوں میں شرکت، ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے ملک بھر سے وسیع مراسلت وغیرہ کا کام مستزاد تھا۔ [۳۳] خود سید صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ دارالمصنفین کے قیام اور معارف کے اجراء کے ابتدائی زمانے میں انھیں روزانہ ۱۲ گھنٹے مسلسل تحریر و تالیف کا کام کرنا پڑا ہے۔ اسی باعث 1916 کے

وسط ہی سے ان کی بینائی متاثر ہونے لگی تھی۔ [۳۴] معارف کو اپنی نوعیت کا مثالی رسالہ بنانے کے لئے سید صاحب نے ان تمام تجربات سے فائدہ اٹھایا جو الندوہ اور الہلال کی سب ایڈیٹری کے زمانے میں انھوں نے حاصل کئے تھے۔ بیسیوں انگریزی رسالے انگلستان اور امریکہ سے اور عربی رسائل مصر وشام وغیرہ سے منگوائے۔ ملک کے مشاہیر اہل قلم سے تعاون کی درخواست کی اور ان سے بلند پایہ مقالے لکھوائے۔ مضامین کے انتخاب میں ذوق صحیح سے کام لیا۔ ان میں مناسب ترمیم واصلاح اور اضافہ کیا۔ فلسفہ قدیم وجدید اور سائنسی موضوعات پر ماہرین فن سے مضامین لکھوائے۔ مولانا آزاد سے خالص فقہی موضوعات پر مضامین حاصل کئے۔ شروع میں مضمون نگاروں کی خدمت میں معقول معاوضے بھی پیش کئے۔ [۳۵] لیکن رسالہ کی مالی حالت کی خرابی کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

معارف کے تمام ظاہری و معنوی محاسن کے باوجود اور پورے ملک میں اور ملک سے باہر اس کی مقبولیت وشہرت کے باوجود یہ حقیقت بڑی افسوسناک ہے کہ اس کے خریداروں کا حلقہ کبھی مدیران کی توقع اور حوصلہ کے مطابق وسیع نہ ہوسکا۔ اس لئے یہ رسالہ ہمیشہ ادارہ پر اپنی کفالت کا بار ڈالے رہا ہے۔

۴۔ اغراض ومقاصد معارف کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے لئے ہمارے پاس سب سے زیادہ مدلل اور مکمل بیان خود اس موقر جریدے کے پہلے فاضل مدیر سید سلیمان ندوی کا ہے جو معارف کے سب سے پہلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ [۳۶] اس بیان کی مختلف شقوں اور نکات سے مسائل کے ہر پہلو پر تسلی بخش وضاحت حاصل ہوجاتی ہے۔

معارف کے اجراء کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے سید صاحب رقم طراز ہیں :

”حاشیہ نشینان بساط شبلی نے اس محسن کی یاد میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی بساط بھر ان کی تحریکوں کو زندہ رکھیں گے۔ اس ضمن میں ایک ضروری کام ماہنامہ ’معارف‘ کا اجراء بھی تھا۔ چنانچہ ’الندوہ‘ کے بعد معارف کے نام سے ایک دوسرا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو علوم و معارف کی پہلی کتاب قرآن حکیم کے نزول کا مہینہ ہے۔“

صاحبان علم کی بے ذوقی، کم حوصلگی اور بے عملی پر سید صاحب ماتم کناں ہیں :

"ملک میں اس وقت علم و مذہب کے متعلق جو خیالات بھی پھیلے ہوئے ہیں وہ بالکل غیر معتدلانہ ہیں ۔ کچھ ایسے اشخاص ہیں جو عقل پرستی کے غرور میں مذہب اور مذہبی علوم کے ساتھ تمسخر سے نہیں شرماتے ۔ دوسری طرف حامیان مذہب و علوم مذہبی کا جمہور اعظم ہے جو عقل و علم، لفائح و حکم، فلسفہ و اسرار کی ضرورت سے منکر ہے ۔ ملک میں دونوں قسم کے مضامین اور تصنیفات ہر روز شائع ہوتے ہیں ۔ ہماری جماعت صلح عام کی منادی ہے ۔ وہ دونوں فریق کو دعوت دیتی ہے ۔ وہ جدید علوم، تازہ خیالات، نئی تحقیقات کی بجان و دل خریدار ہے لیکن اس کے معاوضہ میں بزرگوں کا اندوختہ نہیں کھونا چاہتی ہے ۔ ان نادانوں پر ہنسی آتی ہے جو تمام سرمایہ علمی دیکر بازار فرنگ کی ہر چمکتی ہوئی چیز کے خریدار بن جاتے ہیں ۔ وہ ہر چیز کو خریدنے سے پہلے یہ جان لینا چاہتی ہے کہ ہمارے بزرگوں کے تاریک تہ خانوں میں، ویران خزانوں میں اور مدفون خزانوں میں موجود تو نہیں ۔ اگر ہے تو وہ کون احمق ہوگا جو گھر میں ایک چیز چھوڑکر اس کی تلاش میں گلیوں اور بازاروں کی آوارہ گردی قبول کرے گا ۔"

تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے کیونکر مطابقت حاصل کی جائے اس موضوع پر سید صاحب نشاندہی کرتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں :

"دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے ۔ لوگ اپنی وضع تبدیل کر رہے ہیں ۔ مذاق، تمدن، طرز معاشرت، طریق تجارت، اسلوب گفتگو ہر چیز میں نمایاں انقلاب ہے ۔ اب اگر دلی کی پرانی وضع میں ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر دلی دکنی اور مرزا مظہر جانجاناں کی زبان میں ہم اکسیر بھی بیچیں تو کون خریدنے آئے گا ۔ ہمارے گزشتہ علوم و فنون کا بعینہٖ یہی حال ہے ۔ ہم کو اسی سامان اور متاع کو لیکر اب نئے ساز و سامان سے موجودہ طرز کی ایک بڑی شاپ میں بیٹھ کر شیشہ دار الماریوں میں اپنی دکان سجانی چاہئے ۔"

زمانے کے تقاضوں سے مطابقت اور مناسبت کے موضوع پر علمائے سلف کی ذمہ داریوں کا جائزہ لیتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں :

"اس رسالہ کا موضوع اور مقصد سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لینا چاہئے کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے لیکن موجودہ نسل کی بجائے ہمارے اسلاف کا علمی گروہ دوبارہ دنیا میں آگیا ہے ۔ اس حالت میں اب غور کرو کہ اس گروہ کے کیا علمی مہمات ہوں گے ۔ اس سوال کا

جواب قیاسی اور فرضی نہیں بلکہ اصول و تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے ۔ علمائے سلف اور ان کے کارنامے دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دولت عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعتاً ایک انقلاب پیدا ہوگیا ۔ سب سے پہلے ایک گروہ پیدا ہوا جس نے مختلف زبانوں کے علوم و فنون ترجمے کے ذریعے سے عربی زبان میں منتقل کردیئے ۔ ایک دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوانوں پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں شروع کردیں ۔ نتیجے کے طور پر عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی ، عربیت نے معانی و بلاغت کا قالب بدلا ، اصول فقہ میں منطقی استدلالات پیدا ہوگئے ، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہوگئی ، فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل ہوگئے ۔ مذکورہ بالا حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے علمائے سلف نے ان علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی بلکہ جہاں غلطیاں دیکھیں اصلاح کی ، جو فضول حصہ تھا اس کو الگ کردیا ، جو حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا تھا تحلیل کردیا ، جو اصل عقائد سے آکر ٹکراتا تھا اس کو ادھیڑ کر رکھ دیا

موجودہ دور کا موازنہ علمائے سلف کے دور سے کرتے ہوئے سید صاحب انکشاف فرماتے ہیں :

" آج بعینہٖ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع ہے ۔ ممالک مغربیہ نے اکثر علوم و فنون کے قالب بدل دیئے ہیں ، فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے ، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں ، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے ، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے ، مغربی علوم میں ہزاروں نئے مباحث کی ضرورت پیش آگئی ہے ، اسلوب ادا اور طرز تعبیر کا اختلاف نئے سرے سے ان کی مستقل ترتیب و تہذیب کا طالب ہے "۔

آج کے دور میں اسلاف کس طرح اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے یعنی اسلاف کی روش پر چل کر ہم خود کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے سید صاحب فرماتے ہیں

" اسی گذشتہ مثال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر آج اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدیدہ کو پیش نظر رکھ کر وہی کرتے جو علوم قدیمہ کے ساتھ انھوں نے کیا یعنی

— علم کلام کو فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے میں وہ مرتب کرتے ۔

— تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے ۔

— اور فیصلہ کرے کہ کیا چیزیں کس حد تک قابل قبول ہیں اور نئی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیونکر پیوند دیا جا سکتا ہے یا ان کے نمونہ پر علوم قدیمہ کی روش کیونکر بدلی جا سکتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ آج قوم میں غزالی، رازی، بیرونی، ابن ہیثم، ابن خلدون اور مقریزی موجود نہیں ہیں تاہم اس کے لئے کام پڑا نہیں رہ سکتا اور جو کچھ کام یہاں تک بھی بن آئے وہ قابل قدر ہے۔

دارالمصنفین علامہ مرحوم کے ان ہی تخیلات کا نتیجہ تھا اور ہم اپنی کائنات کے مطابق انھیں مقاصد کو پیش نظر رکھکر کام شروع کرنا چاہتے ہیں۔"

آخر میں معارف سے جن خدمات کی توقع رکھنی چاہئے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"گذشتہ بالا خیالات کے مطابق معارف سے جن خدمات کی توقعات رکھنی چاہئے اور اس کے مقاصد میں جو نوعیت پیش نظر ہوگی وہ حسب ذیل ہے:

— فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتدبہ حصہ پبلک میں لایا جائے۔

— عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے۔

— علوم قدیمہ کو جدید طرز پر ازسرنو ترتیب دیا جائے۔

— علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔

— علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے۔

— اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو۔

— عربی زبان کی نادرالفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے اور دکھایا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں۔

— اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی ادبی تاریخی تمدنی اور

اخلاقی مباحث جو پیدا ہوگئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کئے جائیں ۔

—— اگرچہ صرف انھیں مقاصد پر قناعت کرلی جائے تو بھی ہمارے نزدیک بڑا کام ہے لیکن چونکہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے اس لئے ادبیات ، مباحث تازہ ، مطبوعات جدیدہ ، انتقاد و تقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوانات سے ان کی تلخی و خشکی دور کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔

۳۲؎ شذرات معارف جنوری 1917ء

۳۳؎ سید سلیمان ندوی ایڈیٹر کی حیثیت سے از صدق جدید لکھنؤ ۲۹ جنوری 1954ء صہ ۲

۳۴؎ مکتوبات سلیمانی صہ ۵۵ مکتوب ۳۱ مورخہ ۱۹ جولائی 1916ء

۳۵؎ شذرات معارف فروری 1920ء

۳۶؎ معارف جولائی 1916ء

۵-خوبیاں معارف کا ظاہری پیکر، معنوی حسن اور اس کے نظام اشاعت کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جو اسے عصری صحافت میں ایک انفرادیت اور خصوصی تمغۂ امتیاز عطا کرتی ہیں۔ معارف کے محاسن پر نعیم احمد صدیقی نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ [۳۷]

۱۔ اس کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو جاتا ہے۔

۲۔ آج تک اس رسالہ کی اشاعت میں ناغہ نہیں ہوا۔

۳۔ اس کا سرورق ہمیشہ سادہ متین اور پروقار رہا۔ کبھی اس کو رنگین اور جاذب نظر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حالانکہ ملک کے ممتاز آرٹسٹوں نے اس کے ٹائٹل پیج کو حسین و خوش نما بنانے کی پیشکش کی۔

۴۔ معارف کا ایک خاص امتیاز اس کی غیر معمولی متانت اور سنجیدگی ہے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "سنجیدہ و متین اسلوب میں علمی و ادبی مضامین کا اتنا ضخیم ماہوار مجموعہ قابل داد ہے۔" [۳۸]

۵۔ معارف کی کتابت و طباعت ہمیشہ معیاری رہی اور کاغذ بھی اعلیٰ قسم کا استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں رسالہ معارف اپنے حسن کتابت و طباعت کے باعث معارف پریس کے اشتہار کا کام کرتا تھا اور اس کا شہرہ ضرب المثل کے مانند ہوتا تھا۔ بعد میں گوناگوں وجوہ کے باعث اس معیار میں کمی و پستی آگئی۔ سید صاحب کتابت و طباعت کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں جب ملک کے تمام رسائل پیشگاروں کی مانند چھلنے لگے تھے معارف نے اپنی حیثیت کو برقرار رکھا۔ خود سید صاحب کے بقول:

"معارف کی اشاعت کا وقت وہ تھا جب دنیا میں جنگ و جدال کے شرارے اڑ رہے تھے۔ کاغذ کی گرانی اور سامان طبع کی نایابی نے بڑے بڑے مطبوں کے دیوالے نکال دئے تھے لیکن معارف نے پوری دلیری سے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔" [۳۹]

۶۔ معارف نے عصری صحافت کے عام اور مقبول عوام رجحان کے برخلاف اپنی پوری تاریخ میں چند خصوصی شماروں مثلاً سلیمان نمبر، شیروانی نمبر وغیرہ کے علاوہ کبھی کوئی خصوصی شمارہ یہاں تک کہ سالنامہ بھی نہیں نکالا۔ اس روایت کی بنیاد خود سید صاحب نے قائم کی تھی۔

ضخیم و معیاری خاص نمبر مرتب کرنا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا ۔ ان کی زندگی میں اس کے مواقع بھی کثرت سے آئے لیکن شاہ راہ عام سے ہٹ کر اپنی انفرادی راہ قائم کرنا معارف اور سید صاحب کا عظیم کارنامہ رہا ہے ۔

۷ ۔ معارف میں کبھی اشتہارات شائع نہیں ہوئے ۔ اس خصوصیت میں بعض اور رسالے بھی معارف کے ہم خیال ہیں ۔ معارف میں دارالمصنفین کی مطبوعات کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن اس کی حیثیت مروجہ اشتہار کی نہیں ہے ۔ دراصل معارف کا ہر مقالہ نئے صفحہ سے شروع ہوتا ہے ۔ کوئی مقالہ اگر پورے صفحہ سے پہلے ختم ہو جائے تو باقی جگہ اس مقالہ کی مناسبت سے دارالمصنفین کی کسی کتاب کا تعارف کرا دیا جاتا ہے ۔

۸ ۔ معارف میں تنوع قائم رکھنے کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے یعنی کسی نمبر میں اکتا دینے والی یکسانیت نہ ہو بلکہ تاریخ ، ادب ، سیرت ، شاعری اور فلسفہ و منطق کے رنگا رنگ مضامین کا خوش نما گلدستہ تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ رسالہ کا ہر شمارہ اس بات کی شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔

۹ ۔ معارف کا ایک اہم اور امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کے علمی و تصنیفی جمود کو پاش پاش کر دیا اور خالص علمی و تحقیقی موضوعات پر سنجیدہ تحریریں لکھنے والوں کی ایک پوری نسل تیار کر دی ۔ مثال کے طور پر مناظر احسن گیلانی ، ظفر احمد عثمانی ، عبد الباری ندوی ، میر ولی الدین ، ظفر حسین خان ، مہدی افادی ، عشرت انور ، شوکت سبزواری وغیرہ جو مقالہ نگاری کے مطلع عروج پر خوب چمکے ۔ اگر ان حضرات کو حلقہ معارف کی پیداوار خیال کیا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔ اسی طرح سید صاحب کے فیضان تربیت میں رہ کر ممتاز اہل قلم کی صف میں بیٹھنے والوں میں عبد الرحمن نگرامی ، شاہ معین الدین ندوی ، ریاست علی ندوی ، سعید انصاری ، نجیب اشرف ندوی ، ابو ظفر ندوی ، ابو الحسنات ندوی ، محمد اویس نگرامی ، نجیب اللہ ندوی اور سید صباح الدین عبد الرحمن کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔

---

۳۷ دارالمصنفین کی ادبی خدمات ـــ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ص ۸۰

۳۸ مولانا عبد الماجد دریابادی اور ان کے کارنامے ـــ ضیاء مسعودی ص ۱۲۰

۳۹ سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات ـــ ڈاکٹر خورشید احمد ص ۶۵

۶۔ معاصرین کی رائے معارف کی غیر معمولی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ملک کے بڑے بڑے اہل علم نہ صرف یہ کہ اس کو بہت شوق سے پڑھتے تھے بلکہ اس کو حرز جاں سمجھ کر سنبھال کر رکھتے تھے، صدق دل سے اس کے خیر خواہ اور صمیم قلب سے اس کے حق میں دعا گو رہتے تھے[39]“

• علامہ اقبال بڑی پابندی سے اس رسالہ کا مطالعہ کرتے تھے اور ہر نئے شمارے کے لئے چشم براہ رہتے تھے۔ علامہ موصوف اپنے ایک مکتوب میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

”یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔“[40]

• مولانا محمد علی جوہر کو بھی اس رسالہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ مولانا موصوف اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب کو لکھتے ہیں ”میرے پاس متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں .....

یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں گی۔“[41]

• مولانا ابوالکلام آزاد سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

”صرف یہی ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد للہ شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو خدمت علم و تصنیف کے لئے وقف ہے“[42]

• مولانا عبدالمجید سالک اپنے ایک مضمون میں معارف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”1916 میں دارالمصنفین کا مشہور و معروف علمی پرچہ معارف جاری ہوا جو بلا مبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے اور جس نے ہماری تاریخ و تحقیق کے ذخیرہ کو مالامال کیا۔“[43]

• ایک مرتبہ معارف میں ڈاکٹر نکلسن پر کچھ لکھا گیا تو اس کے متعلق آصف فیضی صاحب نے کیمبرج سے سید صاحب کو مطلع کیا ”معارف میں ڈاکٹر نکلسن پر جو کچھ لکھا گیا اس کو انھوں نے پسند کیا اور معارف کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و خیالات کی آمیزش کی داد دی اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔“[44]

یہی نہیں بلکہ معارف کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر نکلسن نے اسلامی تصوف پر اپنا ایک گراں قدر مقالہ بھی معارف میں اشاعت کے لئے بھیجا جو جون 1923 کے نمبر میں شائع ہوا۔

معارف کی مشرقی و مغربی دونوں ممالک میں مقبولیت کا یہی راز ہے کہ اس نے ملک کی دماغی اور ذہنی رفتار پر ہمیشہ نگاہ رکھی اور اسلام کی مخالفت میں جو بھی لٹریچر شائع ہوا اس

خواہ وہ یورپ کا ہو یا ملک کے اندر، یہاں کے ذہن و دماغ کو متاثر ہونے نہیں دیا ۔

بقول ڈاکٹر خورشید نعمانی :

" نوجوان مسلم اہل قلم کے سامنے مستشرقین یورپ کے پُر فریب دام کی قلعی کھول دی گئی ، ان کے طریق تالیف اور طرز تحقیق کی خامیاں دکھائی گئیں اور خاص طور پر اس بات کو ثابت کیا گیا کہ انھوں نے اسلامی علوم و آداب اور اسلامی کتب میں سے معتبر کتابوں کو نامعتبر بنانے اور نامعتبر کتابوں کی بنیاد پر اپنے نظریوں کے قائم کرنے کا ایک عام شیوہ اختیار کر لیا ہے ۔" [65]

• مرحوم ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس نے معارف سے متعلق مندرجہ ذیل گراں قدر آرا کا اظہار کیا تھا:

" میں معارف کو دنیا کا سب سے بلند پایہ علمی رسالہ سمجھتا ہوں ۔ وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ ایک ماخذ ہو گا ۔ وہ مرجع انام ہے ۔ اور لوگ اب بھی اور آئندہ بھی اس سے استناد کریں گے ۔" [66]

• محمد عبد الملک جامعی مقیم مدینہ منورہ نے معارف کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کی :

" سارے رسالے ، اگر کوئی موجود ہے ، اپنا مقام کھو چکے ، معارف اپنے مقام پر ہے ۔" [67]

• سید صباح الدین عبد الرحمٰن مشہور مترجم اور اہل زبان مولوی ذکاء اللہ کی معارف کے ساتھ تعلق قلبی کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں :

" ایک روز معارف کے کچھ پرچے میرے کمرے سے اٹھا کر لے گئے ۔ ان میں میرے بھی مضامین تھے۔ ان کو پڑھ کر مجھ سے کہنے لگے ـــــ یہ کام تو آپ لوگ کرتے ہیں ، کیسے ٹھوس اور محققانہ مضامین لکھتے ہیں ۔ ایک میں ہوں کہ ساری عمر یوں ہی برباد کی ۔ جس وقت ان کی زبان سے یہ فقرے نکل رہے تھے میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ کس قدر بلند ہیں اور میں کس قدر پست ۔" [68]

• اہل علم کی جانب سے معارف کی پذیرائی اور قدر دانی اور ملک و بیرون ملک کے اخبارات و رسائل کے شاندار خراج تحسین کا ذکر کرتے ہوئے خود سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں :

" معارف کی نسبت ملک کے کثیر و وقیع اور مشہور اخبارات اور رسائل نے مادحانہ اور قدردانہ الفاظ کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ہے ۔ اکثر معاصرین اس کے مضامین کو اپنے اخبار و رسائل میں نقل کرنے کا شرف بخشتے ہیں ۔ ملک کا تمام روشن خیال اور علم دوست طبقہ

بحیثیت مجموعی اس کو وقعت دیتا ہے اور عزیز رکھتا ہے۔" ح۳۹

• معارف کی ستائش اور قدر شناسی کے موضوع پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا یہ جملہ قابل غور ہے جو انھوں نے ندوۃ العلماء مدراس کے خطبہ صدارت کے موقع پر فرمایا تھا :

"معارف کا وجود ندوۃ العلماء کی کامیابی پر ایک برہان قاطع ہے۔" ح۵۰

• سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی دارالمصنفین اور معارف کے ذریعے انجام پانے والے کاموں پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ان الفاظ میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں :

"آپ کے دارالمصنفین کو کسی سند کی ضرورت نہیں .... دارالمصنفین ایسا کام انجام دے رہا ہے جو آج تک ہندوستان میں شروع تک نہیں ہوا، خود معارف اس کا بیّن ثبوت ہے۔" ح۵۱

ح۴۰ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اول ص ۸۰ مکتوب ۴

ح۴۱ خطوط مولانا محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۶۶ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۴۰ء

ح۴۲ مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد بنام سید سلیمان ندوی مطبوعہ رسالہ معارف اکتوبر 1953ء ص ۳۱۳

ح۴۳ مضمون "مولانا عبدالمجید سالک" رسالہ ماہ نو کراچی جنوری ۱۹۵۴ء ص ۲۵

ح۴۴ معارف نامہ مرتبہ ڈاکٹر برہان الدین ص ۵

ح۴۵ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات — ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی ص ۱۹۶

ح۴۶ دارالمصنفین کی علمی خدمات — ڈاکٹر حمید اللہ ص ۱۱۱

ح۴۷ معارف نامہ مرتبہ ڈاکٹر برہان الدین ص ۵

ح۴۸ بزم رفتگاں جلد اول مضمون عنایت اللہ دہلوی ص ۹۴

ح۴۹ کتابچہ تعارف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی ص ۲۵

ح۵۰ شذرات معارف اپریل ۱۹۱۷ء ص ۲

ح۵۱ شذرات معارف مئی ۱۹۲۲ء ص ۲